مقالہ برائے امتحان ایم اے (اردو) جامعۂ عثمانیہ ۱۹۶۶ء

زیر نگرانی پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ

سنہ اشاعت بعد نظر ثانی : ۱۹۶۷ء

ناشر : انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش

تزئین، کتابت و ٹائیٹل : غوث محمد

طباعت لیتھو : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

ٹائیٹل بلاک : وینس بلاک سرویس

ٹائیٹل پرنٹنگ : رین بو پرنٹرس

تعداد دو ہزار

قیمت : دو روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ : ۲۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ، فون ۵۱۵۲۰

فہرست

بہت دن ہوئے ڈاکٹر زور مرحوم کی کوششوں سے حیدرآباد میں جب ادارۂ ادبیات اردو کی بنا ڈالی گئی تو اس ادارے نے سب سے پہلے جو کتاب شائع کی وہ جامعۂ عثمانیہ کے دو طلبا کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھی۔ ان میں سے ایک طالب علم مخدوم محی الدین تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن تحفظِ اُردو آندھرا پردیش بھی اپنے اشاعتی پروگرام کا آغاز ایم اے (اُردو) کے ایک طالب علم داؤد اشرف کی کتاب سے کر رہی ہے اور یہ کتاب مخدوم محی الدین کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہے۔ یہ ایک اتفاق ہی لیکن بڑا خوشگوار اتفاق ہے ـــــ داؤد اشرف کی اس کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے مجھے کچھ اور خوشگوار وابستگیوں کا خیال آرہا ہے۔ اس سلسلے میں

پہلی بات جو میں فراموش نہیں کر سکتا یہ ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد چادر گھاٹ کالج میں مجھے مضمون نویسی کے ایک مقابلے میں اوّل آنے پر جو کتاب بہ طور انعام ملی تھی، وہ مخدوم محی الدین کا پہلا شعری مجموعہ "سرخ سویرا" تھی ۔ اس دیباچے کے توسط سے "سرخ سویرا" کے "گلِ تر" مخدوم صاحب، ان کی شخصیت اور ان کے فن و فکر کو خراج تحسین ادا کرنا میرے لیے ایک اور خوشگوار وابستگی ہے جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا ۔ مجھے اس بات پر بھی فخر و مسرت کا احساس ہے کہ میرا تعلق بھی اسی ضلع میدک سے ہے جس نے مخدوم محی الدین جیسے باکمال شاعر کو پیدا کیا ۔ مخدوم صاحب کی شخصیت اور شاعری پر میں اور میرا ضلع (میدک) فخر کرتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس بلند پایہ فن کار، محبوب شخصیت اور سچے عوامی خدمت گذار کی بڑائی کو ایک چھوٹے سے ضلع میں محدود کر رہا ہوں ۔ سچ تو یہ ہے کہ مخدوم صاحب حیدرآبادی تہذیب کے ایک بہترین نمائندہ ہیں وہ ہماری ریاست آندھرا پردیش کے ایک بہترین سپوت اور اردو کے ایک نامور شاعر ہیں جس نے اپنی عوامی اور ادبی خدمات کے ذریعے ملک اور بیرون ملک میں زبردست شہرت اور ناموری حاصل کی ہے ۔ سابق ریاست حیدرآباد کے علاقے میں مخدوم صاحب نے اپنی شخصیت اور شاعری کے سحر سے نوجوان نسل کو بہت متاثر کیا ہے ۔ پولیس ایکشن سے پہلے اور

بعد بہت سے نوجوان ان سے متاثر ہوکر عوامی تحریکوں اور کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوئے۔ کسان، مزدور اور عوام ہمیشہ مخدوم صاحب کے محبوب رہے ہیں۔ ان کے سیاسی عقائد اور نظریوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی عوام دوستی سے انکار نہیں کیا جاسکتا زندگی کی اعلیٰ اقدار سے پیار اور سچی انسانیت دوستی ان کی اعلیٰ خصوصیات ہیں۔ مخدوم صاحب کے خیالات سے شدید قوم پرستی بھی ٹپکتی ہے۔ چینی جارحیت کے خلاف اور دوسرے موقعوں پر ایک سچے محبِ وطن کا رول مخدوم صاحب نے ادا کیا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تلنگانہ میں کمیونسٹ تحریک کی مسلح سرگرمیوں کو پارلیمانی جمہوریت کی طرف لانے میں مخدوم صاحب نے اہم رول ادا کیا ہے۔

داؤد اشرف نے اپنے اس مقالے میں بڑی محنت کے ساتھ اس اہم شخصیت اور اس نامور شاعر کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ تحقیقی اور علمی اعتبار سے یہ مقالہ یقیناً ایک اہم علمی اور ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے جو مخدوم محی الدین پر لکھا گیا۔ اس کے لیے میں جامعۂ عثمانیہ اور اس کے شعبۂ اردو کو بھی مبارکباد دیتا ہوں جس نے حیدرآباد اور جامعۂ عثمانیہ کے نامور سپوت پر اس اہم تحقیقی کام کے لیے موقع فراہم کیا ۔۔۔ اس مقالے کے بعض حصے مختلف اخبارات اور رسائل

میں شائع ہو چکے ہیں۔ ماہنامہ صبا کے مخدوم نمبر میں مخدوم محی الدین کے زیرِ عنوان مخدوم صاحب کی زندگی، شخصیت اور سیرت کے بارے میں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ بھی بہت کچھ اس مقالے سے لیا گیا ہے۔

اس مقالے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے داؤد اشرف نے ضروری نظرِ ثانی کر لی ہے۔ انجمنِ تحفظِ اردو نے اپنے اشاعتی پروگرام کے لیے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے جو ہر طرح سے موزوں ترین انتخاب ہے۔ انجمن تحفظ اردو نے اب تک اپنی تمام تر توجہ آندھرا پردیش میں اردو بولنے والوں کے مسائل اور مشکلات کے حل اور اردو زبان کو اس کا صحیح موقف دلانے کی جانب مرکوز کر رکھی تھی۔ ہم اردو والوں کی جدوجہد کے نتیجے میں ہماری زبان کو اس ریاست میں قانونی موقف مل چکا ہے اس موقف کو زیادہ واضح اور مستحکم بنانے کے لیے ہمیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے خوش قسمتی سے آندھرا پردیش کے قیام کے بعد اس نئی ریاست کی قیادت نے جو لسانی پالیسی اختیار کی ہے اس سے وسیع النظری، فراخ دلی اور انصاف پسندی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ بھی ہم اردو بولنے والوں کے ساتھ انصاف ہوگا اور ہمارے حقوق کو سلب اور ہمارے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

حالات سے فرصت پا کر انجمن تحفظِ اردو نے اس ریاست میں

اپنی سرگرمیوں کے دائرے کو اپنے اشاعتی پروگرام کے ذریعے وسیع کردیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے تحفظ کے لیے انجمن کی پچھلی سرگرمیوں، پچھلی جدوجہد اور تحریکوں کی طرح یہ نیا پروگرام بھی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ اس انجمن کی روایات شاندار رہی ہیں نمود و نمائش سے ہٹ کر اس نے ہمیشہ ٹھوس اور تعمیری کام کی جانب توجہ کی ہے۔ خاموش خدمت کے ساتھ ہی ساتھ علمی، ادبی، تعلیمی اور تحقیقی مطبوعات کی اشاعت ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے جس کے لیے مجھے یقین ہے کہ انجمن کو ہر گوشے سے اشتراک و تعاون ملے گا اور اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۱۴ نومبر ۱۹۶۷ء

ماڈل ہاؤز۔ ایم ایل ایز کوارٹرز
حیدر گوڑہ، حیدرآباد

ایم باگا ریڈی
صدر انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش

مخدوم محی الدین ضلع میدک کے تعلقہ اندول میں پیدا ہوئے ان کے والد غوث محی الدین اندول میں تحصیل کے صیغہ دار (کلرک) تھے۔ مخدوم کے جدِ اعلیٰ حضرت ابو سعید خدری تھے جو آنحضرت صلعم کے صحابی تھے۔ مخدوم اور ان کے خاندان کو ٹھیک اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری کی اولاد کب ہندوستان آئی تھی۔ مخدوم کے نانا اور دادا دونوں شمالی ہند کے رہنے والے تھے مخدوم کے نانا سید جعفر علی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے نتیجے میں شاہ جہاں پور (یو۔پی) سے میدک آئے تھے۔ ان کے دادا رشید الدین اعظم گڑھ سے حیدر آباد آئے تھے۔ وہ فوج میں ملازم تھے۔

مخدوم محی الدین کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے
ان کی والدہ کا کہنا ہے کہ جب موسیٰ ندی میں طغیانی (ستمبر ۱۹۰۸ء)
آئی تھی اس وقت مخدوم کی عمر آٹھ ماہ کی تھی لیکن مخدوم کی خالہ کہتی
ہیں کہ مخدوم اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوے تھے۔ والدہ کے بیان
کے مطابق مخدوم ۴ فروری ۱۹۰۸ء کو پیدا ہو مختلف کتابوں بشمول "گلِ تر"
میں مخدوم کے جو حالاتِ زندگی شائع ہوے ہیں، ان میں بھی تاریخ اور
سنِ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مخدوم کے پھوپھی زاد بھائی
نظام الدین صاحب کے یہاں ایک رجسٹر ہے جس میں خاندان کے تقریباً
تمام افراد کی تاریخ پیدائش درج ہے۔ اس رجسٹر کے مطابق مخدوم کی
تاریخ پیدائش ۲ فروردی ۱۳۱۷ف م ۴ فروری ۱۹۰۸ء م یکم محرم الحرام
۱۳۲۶ھ ہے۔ یہ تاریخ مخدوم کی والدہ کی بیان کردہ تاریخ پیدائش
کے عین مطابق ہے۔ اس لیے یہی مخدوم کی صحیح تاریخ پیدائش
ہونی چاہیئے۔

مخدوم کا تعلق غریب گھرانہ سے ہے ان کی ابتدائی زندگی عسرت
اور پریشانی میں بسر ہوی ان کے والد غوث محی الدین نہایت خوش مزاج
زندہ دل اور بے پروا قسم کے آدمی تھے جو کچھ کماتے خرچ کر دیتے ان کی
اپنی کوئی جائداد یا ملکیت نہیں تھی۔ وہ قرضہ چھوڑ کر عین جوانی میں ہی
جبکہ ان کی عمر ۲۹، ۳۰ سال کی ہوگی انتقال کر گئے۔ جب والد کا
سایہ سر سے اٹھ گیا تو مخدوم کے چچا بشیر الدین سرپرست بن گئے۔ والد

کے انتقال کے وقت مخدوم کی عمر تقریباً چار سال کی تھی وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے فرزند تھے۔ مخدوم کے چچا بشیرالدین کنبہ پرور اور دردمند آدمی تھے۔ خاندان کی بیوہ بہنوں اور یتیم بچّوں کی پرورش اور دیکھ بھال کو وہ اپنا فرض جانتے تھے۔ ان کی تنخواہ اگرچہ کم تھی لیکن اس محدود آمدنی میں اپنے زیرِ پرورش سب ہی افرادِ خاندان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ سب کو ایک ہی قسم کا کپڑا فراہم کرتے اور سب کے ساتھ ایک ہی قسم کا کھانا ایک ہی دسترخوان پر کھاتے تھے بشیرالدین بھی اپنے بھائی کی طرح تحصیل کے صیغہ دار (کلرک) تھے لیکن بعد میں بتدریج ترقی پاتے ہوئے وہ تحصیلدار ہو گئے تھے۔

مخدوم نے عربی اور قرآن شریف کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ گھر پر دادا انھیں پڑھایا کرتے تھے وہ قرآن شریف کے درس گھر کے علاوہ مسجد میں بھی لیا کرتے تھے۔

مندر اُن کا پہلا مدرسہ تھا۔ پیپل کے درخت کے نیچے مندر کے چبوترے پر انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کی شروعات کی۔ یہاں انھوں نے تلگو بھی پڑھی۔ اس کے بعد ابتدائی جماعتوں کی تعلیم اندول، منولی، اور پٹن چیرو کے مدارس میں حاصل کی۔ والدہ کے ساتھ وہ تیسری اور چوتھی جماعت کی تعلیم تک ہی رہے۔ والد کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ اس کے بعد سے والدہ کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ والدہ دوسری شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد چلی

گئی تھیں۔ والدہ سے جدا ہونے کے بعد طویل عرصے تک مخدوم نے اپنی والدہ کو دیکھا تک نہیں۔ اور نہ ہی گھر میں ان کی والدہ کے تذکرے ہوتے تھے۔ حیدرآباد میں کالج میں داخلے کے بعد مخدوم کو جب معلوم ہوا کہ ان کی والدہ محترمہ حیدرآباد ہی میں ہیں تو انھوں نے اپنے چچا سے کہا کہ اگر اُن کی اجازت ہو تو وہ اپنی والدہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چچا نے اس وقت بتایا کہ وہ محض اس خیال سے کہ والدہ سے جدائی کے خیال سے تکلیف نہ پہنچے' والدہ کے تذکرے سے احتراز کرتے رہے ہیں۔

مخدوم کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا۔ وہ ابھی وسطانی درجوں (مڈل اسکول) میں ہی زیر تعلیم تھے لیکن شرر کے بیشتر ناول پڑھ چکے تھے۔ گھر میں ناول پڑھنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے چوری چھپے ناول پڑھتے۔ ماہ نامہ نگار کا پابندی سے مطالعہ کرتے۔ نگار کے علاوہ نیرنگ خیال' ہمایوں' زمانہ' رسالہ اردو جو اس زمانے میں اورنگ آباد سے شائع ہوتا تھا اور اس وقت کے تقریباً تمام مقبول اور مشہور رسائل ان کے زیر مطالعہ رہتے۔ داغ اور امیر مینائی کی کئی غزلیں بھی انھیں یاد ہو چکی تھیں۔ میٹرک تک وہ شبلی کی تقریباً تمام کتابیں' سرسید کی آثار الصنادید' نیاز فتح پوری کا ایک ایک لفظ اور قاضی عبدالغفار اور پریم چند کی تحریریں پڑھ چکے تھے۔ اس دوران میں فارسی کی استعداد اس درجہ ہو چکی تھی کہ شاہ نامہ' دیوان صائب' دیوان حافظ اور اخلاق محسنی جیسی کلاسکس ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ مخدوم کے خاندان

یہ ان کے پھوپی زاد بھائی نظام الدین اور خالہ زاد بھائی عبدالعزیز صاحب اچھا اور ستھرا ادبی مذاق رکھتے تھے جس کی وجہ سے مخدوم کے ادبی ذوق کی تربیت ہوئی۔

مخدوم نے ابتدائی جماعتوں کی تعلیم جن مدارس میں حاصل کی ان میں حیدرآباد کا دھرم ونت ہائی اسکول بھی شامل ہے۔ اس زمانے میں وہ اپنے دادا کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ چچا کا تبادلہ سنگاریڈی ہوا تو چچا کے ساتھ سنگاریڈی چلے گئے اور سنگاریڈی میں انھوں نے مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ سنگاریڈی سے چچا کا تبادلہ حیدرآباد ہوا اور حیدرآباد آکر مخدوم نے منشی کا امتحان کامیاب کیا۔ منشی کی تعلیم انھوں نے "نائٹ کلاس" میں حاصل کی تھی۔ پھر چچا کا تبادلہ میدک ہوا تو چچا نے انھیں میدک بلوالیا۔ میدک میں انھوں نے انگریزی کے پرچے کی تکمیل کی۔ منشی کامیاب کرنے کے بعد صرف انگریزی کے پرچے کی تکمیل میٹرک کی تکمیل سمجھی جاتی تھی۔ انگریزی کے پرچے کی تکمیل کے لیے انھیں دو تین سال تک اسکول میں انگریزی پڑھنی پڑی۔ اس زمانے میں انھیں کتابوں اور رسائل کے مطالعہ کے ساتھ آوٹ ڈور گیمس (میدانی کھیلوں) سے خاصی دلچسپی تھی۔ فٹ بال اور ہاکی ان کے محبوب کھیل تھے۔ لانگ جمپ، ہائی جمپ، ہائکنگ اور بھاگ دوڑ کے مقابلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اسکاوٹس تحریک سے بھی ان کا تعلق تھا۔

مخدوم اپنے چچا سے بے حد متاثر ہیں۔ چچا کی زندگی اور کردار نے مخدوم کی شخصیت اور تعمیر پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ چچا کی زندگی اصولی اور ذات مجمع الصفات تھی۔ وہ جیسا سوچتے اور جو کہتے اس پر زندگی میں عمل بھی کرتے تھے۔ خلوص و ہمدردی اور محبت و مروّت کے تو وہ پیکر تھے۔ وہ گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی شخصیتوں سے بے حد متاثر تھے۔ خود بھی کھادی پہنتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ وہ مساوات کے حامی اور سادگی پسند تھے اور تحریک خلافت کے گن گاتے تھے۔ مخدوم کو اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جب حیدرآباد آئے تھے تو وہ مکہ مسجد میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرنے والے تھے۔ مخدوم اپنے چچا کے ساتھ اس جلسے میں شرکت کے لیے جانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے سخت ضد بھی کی تھی۔ چچا انھیں اپنے ساتھ تو نہیں لے گئے لیکن جب مکہ مسجد سے واپس ہوئے تو مخدوم کے لیے گاندھی ٹوپی لیتے آئے۔ مخدوم کہتے ہیں کہ انھوں نے جب پہلی بار گاندھی ٹوپی اوڑھی تھی کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا یہ تجربہ ان کے لیے بڑا ہی "سنسنی خیز" تھا۔

چچا عام طور پر دسترخوان پر سب کو اہم اہم خبریں سنایا کرتے تھے ۱۹۱۷ کے روسی انقلاب کے بارے میں سب کو انھوں نے بتایا تھا کہ "روس میں انقلاب آگیا ہے۔ غریبوں نے بادشاہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا ہے۔ اور لینن کی رہنمائی میں بالشویک پارٹی اقتدار حاصل

کرچکی ہے جس کے نتیجے میں وہاں مساوات قائم ہو چکی ہے۔ اور سب ایک دستر خوان پر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ مخدوم کو اس وقت لینن، بالشویک پارٹی اور عوامی اقتدار کے معنی سمجھ میں نہیں آئے لیکن یہ بات دلچسپ معلوم ہوی کہ وہاں سب مل کر ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے ہیں۔

چچا انگریزوں کے سخت خلاف تھے وہ بادشاہت اور جاگیرشاہی کی زیادتیوں اور مظالم کو بھی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے اور گھر میں ہمیشہ ذکر کیا کرتے تھے کہ کسانوں اور کاشتکاروں سے لگان وصول کرنے میں سختی اور زیادتی برتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کو بچپن ہی سے شاہی اور جاگیر دارانہ نظام سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

مخدوم کے گھر میں سخت مذہبی ڈسپلن تھا۔ پابندی سے نماز ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عصر اور مغرب کے درمیان "ختم خواجگان" پڑھنا بھی لازمی تھا۔ اس کے علاوہ مسجد میں نمازیوں کے لیے وضو کا پانی بھرنا اور مسجد میں جاروب کشی مخدوم کے فرائض میں داخل تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد دن بھر کی پڑھائی اور "خطاطی" کے لیے بیٹھ جانا پڑتا تھا۔ ہوم ورک نہ کرنے پر چچا سزا دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مخدوم نے خوشخطی کی چالیس سطریں نہیں لکھیں۔ پہلی سطر کے نیچے ایضاً ایضاً ڈال دیا۔ مخدوم کی اس حرکت پر چچا پہلے تو کچھ لطف اندوز ہوے لیکن بعد میں سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور مخدوم کو سزا دی۔ وقت پر کام نہ کرنے اور پڑھائی میں دلچسپی نہ لینے کو چچا گوارا نہیں کر سکتے تھے مہربان

اور مشفق ہونے کے باوجود اس معاملے میں وہ سختی برتتے تھے۔

گاؤں میں متعدی امراض کے پھیل جانے کے باوجود مخدوم کے چچا گاؤں چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ حالانکہ عام طور پر لوگوں کی کثیر تعداد دوسرے مقامات پر منتقل ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے ہی گاؤں میں متعدی امراض سے متاثرہ افراد کی تیمارداری کرتے اور مرنے والوں کے آخری رسوم خود ادا کرتے تھے۔ مخدوم اس کام میں چچا کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

میٹرک کی تکمیل کے بعد مخدوم کے لیے تعلیم جاری رکھنا مشکل تھا۔ چچا تو منشی تک تعلیم دلانے کے بعد ہی مخدوم کو ملازمت اختیار کرنے کا مشورہ دے چکے تھے تاکہ ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے مخدوم کو ایک عہدیدار جنگلات کے پاس بھجوایا بھی تھا لیکن اس عہدہ دار جنگلات سے ملاقات کے نتیجہ میں مخدوم کو اعلیٰ تعلیم کی ترغیب ملی۔ اس عہدہ دار جنگلات نے مخدوم کا تفصیلی انٹرویو لینے اور ان کے جوابات سے خوش اور متاثر ہونے کے بعد کہا تھا کہ ملازمت سے ان کی ترقی کے دروازے بند ہو جائیں گے اور انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ چچا اعلیٰ تعلیم کے مصارف برداشت کرنے کے موقف میں نہیں تھے لیکن جامعہ میں داخلہ لینے کی خواہش مخدوم کے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ چنانچہ جامعہ میں داخلہ لینے اور اعلیٰ تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے مخدوم کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ جامعہ میں داخلہ کے لیے جب وہ حیدرآباد آئے تو ایک رشتہ دار کے یہاں ان کے رہنے اور کھانے کا انتظام تو ہو گیا

لیکن پھوپھی زاد بھائی نظام الدین اور دوسرے دوست احباب کو انٹرمیڈیٹ میں داخلہ اور دوسرے تعلیمی مصارف کا بندوبست کرنا پڑا۔ اس طرح مخدوم نے ۱۹۲۹ء میں جامعۂ عثمانیہ میں داخلہ حاصل کر لیا۔ انٹرمیڈیٹ میں ان کے مضامین اختیاری اردو فارسی اور معاشیات تھے۔

اس زمانے میں جامعاتی درجوں میں دینیات یا اخلاقیات کی تعلیم لازمی تھی۔ مخدوم کو دینیات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دینیات کی کلاسوں سے اکثر غائب رہتے۔ مخدوم کے دوست احباب پراکسی کے ذریعہ مخدوم کی حاضریوں کی تکمیل کروا دیتے لیکن دینیات کی جماعتوں میں صرف دو حاضریوں کی کمی کے باعث انٹرمیڈیٹ میں انھیں ایک سال کے لیے روک دیا گیا۔

انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں عدم شرکت اور ایک سال کے ضائع ہو جانے کے بعد مخدوم نے اس رشتہ دار پر مزید بار اور بوجھ بننا مناسب نہیں سمجھا جن کے ہاں ان کے قیام و طعام کا انتظام تھا۔

اس گھر کو چھوڑنے کے بعد مخدوم کو سخت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رہنے کے لیے ٹھکانہ، کھانے کا بندوبست اور تعلیمی مصارف ان کے لیے ایک مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مخدوم نے ٹیوشن شروع کیے۔ اسی سلسلہ میں انھیں ایک عجیب کام بھی ملا۔ ایک نواب صاحب کو کسی اینگلو انڈین لڑکی سے عشق ہو گیا تھا وہ عشق تو کرتے تھے لیکن عشق کا انگریزی میں اظہار ان کے لیے ممکن نہ تھا وہ مخدوم سے

عاشقانہ خطوط لکھوا کرتے تھے۔ مخدوم کو اُن عاشقانہ خطوط لکھنے کے معاوضہ میں کچھ پیسے مل جاتے تھے۔ مخدوم اس وقت کم عمر تھے۔ ناتجربہ کار اور معاملاتِ عشق سے ناواقف۔ اس لیے عاشقانہ خطوط لکھنے کے لیے انھیں اہم اور مشہور شخصیتوں کے عاشقانہ خطوط کا مطالعہ کرنا پڑا جو انکے پہلے مضمون "گیٹے کے مکتوباتِ محبت" کے لیے تحریک بھی ثابت ہوا جو مکتبۂ ابراہیمیہ کے رسالہ مکتبہ میں شائع ہوا تھا جس کے مدیر پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔ اس وقت مخدوم کی آمدنی بہت قلیل، محدود اور غیر مستقل تھی۔ اخراجات اور ضروریات کی تکمیل کے لیے آمدنی کے دوسرے مختلف ذرائع اور وسائل تلاش کرنا ضروری تھا۔ مخدوم کے ایک دوست (جو اب ڈاکٹر یوسف مرزا ہیں) کے یہاں MINERAL POTS فروخت کرنے کی ایک ایجنسی تھی۔ انھوں نے مخدوم کو اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ اُن برتنوں MINERAL POTS کا پانی کئی امراض کے لیے سود مند سمجھا جاتا تھا۔ برتنوں کے دام بہت زیادہ تھے۔ لیکن ان پر ۳۳ فیصد کمیشن ملتا تھا۔ مخدوم کافی بھاگ دوڑ اور محنت کے بعد ایک ہی "POT" فروخت کرسکے۔ کمیشن کے معاوضہ میں کافی روپیہ ملا۔ ان پیسوں میں کپڑے اور کچھ دوسرا ضروری سامان خریدا اور افضل گنج کی ایک ہوٹل (خلیل کا ہوٹل) میں رقم ڈپازٹ کروا کے اپنے کھانے کا کچھ عرصے کے لیے بندوبست کرلیا۔ ایک ہی برتن فروخت کرنے کے بعد مخدوم نے یہ کاروبار ترک کردیا کیوں کہ اس میں وقت بہت ضائع

ہوتا تھا اور دن بھر مارے مارے پھرنا پڑتا تھا۔

"رشتہ دار" کا گھر چھوڑنے کے بعد رہنے کے لیے ٹھکانہ کا مسئلہ بہت ٹیڑھا تھا۔ مخدوم کے ایک دوست نورالہدیٰ کے والد سلطان بازار کی مسجد میں پیش امام تھے۔ انھوں نے اپنے والد سے کہہ کر مخدوم کو مسجد میں سونے کی اجازت دلوادی۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد مخدوم رات کو اس مسجد میں پہنچ جاتے اور شیروانی اور جوتوں کا تکیہ بنا کر سوتے۔ ان ہی دنوں ایک بار مخدوم کے یہاں کچھ بھی پیسے نہ تھے جس کی وجہ سے انھیں ۴۸ گھنٹوں تک بھوکا رہنا پڑا۔ انھوں نے نہ کسی سے اس کا ذکر کیا اور نہ کسی دوست سے پیسے مانگے۔

۴۸ گھنٹوں تک بھوکے رہنے کے بعد وہ اپنے ایک رشتہ کے چچا کے ہاں گئے۔ وہاں بھی وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اس گھر کی ایک لڑکی نے مخدوم کے تھکے اور اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کھانے کے لیے کہا۔ مخدوم تیار ہو گئے اور ۴۸ گھنٹے کا روزہ ختم ہونے کے بعد شیروانی سمیت اسی گھر میں چھ سات گھنٹے تک سوتے رہے۔ مخدوم کے لیے اس روز اپنے ہاتھ سے روٹیاں پکا کر لانے اور انھیں کھلانے والی یہی لڑکی بعد کو مخدوم کی شریک حیات بن گئی اور مخدوم کی مستقل دیکھ بھال ان کا مقدّر بن گئی۔

مخدوم اور ان کے ساتھی نورالہدیٰ نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے مل کر ایک نئے ڈھنگ کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ نورالہدیٰ کو آرٹ

اور لٹریچر سے گہری دلچسپی تھی ان کا مطالعہ وسیع اور ذوق ستھرا تھا۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ بڑھیا تصاویر اور اعلیٰ درجہ کی پنٹنگز کے REPRODUCTIONS باہر سے منگوائے جائیں اور انھیں فریم کرکے یہاں فروخت کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کاروبار سے روپیہ بھی کمایا جاسکے گا اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں میں تصاویر اور پنٹنگز کا اچھا ذوق بھی پیدا ہوگا۔ اس کاروبار کو شروع کرنے کے لیے کچھ سرمایہ کی ضرورت تھی۔ مخدوم نے چچا سے یہ کہہ کر مدد مانگی کہ انھیں مزید زحمت نہیں دی جائے گی۔ چچا نے کاروبار کرنے کے لیے پیسے دے دیے۔ سرمایہ جمع کرنے کے بعد ملک پیٹھ میں ایک مختصر سا مکان کرایہ پہ لیا گیا۔ لکڑی اور شیشہ خریدا گیا۔ لکڑی اور شیشہ کاٹنے کی مشین اور دوسرا ضروری سامان فراہم کیا گیا۔ اس طرح ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم ہوگیا۔ شاہ کار تصاویر اور پنٹنگز کے REPRODUCTIONS لندن اور کچھ کلکتہ سے منگوائے گئے۔ انھیں فریم کیا گیا۔ فریم کی ہوئی تصاویر اور پنٹنگز تیار تھیں لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ انھیں کس طرح فروخت کیا جائے اور کون فروخت کرے؟ چنانچہ "ہاکر کی بنڈی" تیار کی گئی۔ بنڈی کے تیار ہونے پر اس بنڈی میں تصویریں رکھ کر خود مخدوم اور ان کے دوست بنڈی ڈھکیلتے نکلے۔ شہر کی سڑکوں پہ بنڈی لے کر گھومتے رہے۔ پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں کو جنھیں تصاویر اور آرٹ کا شوق تھا، یہ تصویریں دکھائی گئیں، مگر انھیں یہ تصویریں پسند نہ آئیں۔ مخدوم اور ان کے

دوست کافی کوششوں اور محنت کے بعد ایک ماہ میں ایک تصویر بھی فروخت نہ کرسکے جو کچھ بھی قلیل سرمایہ اس کاروبار میں لگایا گیا تھا، وہ تمام کا تمام ضائع ہوتا نظر آتا تھا۔ اب ان لوگوں نے بالی ووڈ کے فلمی ستاروں کی تصویریں اکٹھا کیں۔ انھیں فریم کیا اور بنڈی میں سجا کر نکلے۔ یہ تصویریں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگیں۔ جو سرمایہ ضائع ہوگیا تھا، اس میں سے کچھ واپس مل گیا۔ اس کے بعد یہ کاروبار ہی بند کردیا گیا۔ ان ہی دنوں مخدوم کو "مشیر دکن" میں مترجم کی حیثیت سے کام بھی مل گیا۔

انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کے بعد بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے میں مخدوم حسین نے پوری طرح ان کی مدد کی جن کے بھتیجے کو مخدوم پڑھاتے تھے۔ مخدوم حسین لندن سے الکٹریکل انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کرکے آئے تھے۔ انھوں نے مخدوم میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش اور شوق کو دیکھ کر وعدہ کیا کہ نوکری ملنے پر وہ مخدوم کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لیں گے۔ انھوں نے نوکری ملنے کے بعد اپنا وعدہ پورا کیا۔ تعلیمی اخراجات اپنے ذمہ لے لیے۔ داخلہ فیس، ہوسٹل فیس، کتابوں کے اخراجات وغیرہ کی مخدوم حسین ہی تکمیل کرتے تھے۔

مخدوم کو جامعہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی سے مولینا وحیدالدین سلیم سے پڑھنے کی خواہش تھی۔ ان دنوں مولینا وحیدالدین سلیم کی کی قابلیت اور صلاحیتوں کے حیدرآباد میں بڑے چرچے تھے۔ مخدوم نے

جامعہ میں پہلی بار شرکت حاصل کرنے کے بعد اردو فارسی کے مضامین خاص طور پر اس لیے منتخب کیے کہ انھیں مولانا موصوف سے فیضان حاصل کرنے کا موقع ملے لیکن داخلہ حاصل کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مولینا وحید الدین سلیم کا انتقال ہو گیا۔ مخدوم ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کی بجائے مولوی عبدالحق آئے۔ بی اے میں مخدوم کے مضامین اردو اور فارسی تھے اور یم اے میں اردو۔

جامعہ عثمانیہ سانچہ توپ (گن فاؤنڈری) میں قائم تھی۔ جامعہ کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی۔ اس لیے ایک درس ایک عمارت میں ہوتا تھا تو دوسرا کسی اور عمارت میں جو دو چار فرلانگ دور ہوتی۔ اردو والوں کی جماعتوں کا عجیب حال تھا۔ مولوی عبدالحق اکثر باغ عامہ میں کسی درخت کے نیچے طلبا کو درس دیا کرتے تھے۔ بارش یا کسی اور مجبوری کی صورت میں ان کی جماعتیں لائبریری (موجودہ پیکنگ رسٹورنٹ واقع عابد روڈ) میں ہوا کرتی تھیں۔ پروفیسر سجاد دیکاجی ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں رہتے تھے اور وہیں طلباء کو لکچر کے لیے بلوا لیتے تھے ڈاکٹر زور مرحوم اور مولوی عبدالقادر سروری کے درس لسانیات منزل میں ہوتے تھے جو فتح میدان سے قریب ہے۔ ڈاکٹر زور ہمیشہ طلباء کی ادبی مصروفیات کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ وہ ذہین اور باصلاحیت طالب علموں کو مضامین اور کتابیں لکھنے کی ترغیب دیتے۔ مخدوم کی پہلی نثر کی کتاب "ٹیگور اور ان کی شاعری" ڈاکٹر زور کے تیار کردہ

ادارہ ادبیات حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی کچھ ہی عرصہ بعد اس کا دوسرا ایڈیشن اقبال اکیڈمی سے شائع ہوا اس کتاب کے بعد مخدوم اور میرحسن کا ڈرامہ "ہوش کے ناخن" بھی جو برنارڈشا کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ تھا، ادارۂ ادبیات سے شائع ہوا۔

جامعۂ عثمانیہ میں مخدوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ مخدوم کے حلقۂ احباب میں ہر قسم کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں اور عام طور پر آپس میں بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ ان میں سب سے بڑھ چڑھ کر مخدوم اور میرحسن حصہ لیا کرتے تھے۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ بہار میں زلزلہ نے تباہی مچائی۔ مخدوم اوران کے چند ساتھیوں نے سوچا کہ کوئی ڈرامہ اسٹیج کیا جائے اور اس کی آمدنی بہار کے مصیبت زدگان زلزلہ کی امداد کے لیے دی جائے۔ مخدوم اوران کے دوستوں نے اشتیاق حسین قریشی کا ایک ڈرامہ سینٹ جارج گرامر اسکول کے جمنازیم میں پیش کیا۔ اس ڈرامہ میں ہیرو کا پارٹ خود مخدوم نے ادا کیا تھا۔ دوسرے اہم کردار دیگر دوست احباب کے سپرد تھے۔ اس ڈرامہ کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ مخدوم کی اداکاری اس قدر موثر اور بڑھیا قسم کی تھی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ میں یوم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے موقع پر ایک اور ڈرامہ پیش کرنے کی تجویز زیر غور تھی۔ اس سے پہلے ہر سال کسی مشہور مصنف کا لکھا ہوا کوئی مطبوعہ ڈرامہ ہی پیش کیا جاتا تھا، لیکن اس بار مخدوم اور طلبائے جامعۂ عثمانیہ کی یونین کے صدر میرحسن نے

جو آپس میں گہرے دوست تھے طے کیا کہ ڈرامہ خود مل کر لکھیں گے۔
پروفیسر حسین علی خان کے مشورے پر برنارڈ شا کا ڈرامہ WIDOWER'S
HOUSES کا چولا بدل کر اسے اردو میں اپنانا طے ہوا۔ چنانچہ مخدوم اور
میر حسن نے مل کر اس ڈرامہ کو اردو کا جامہ پہنایا۔ حیدرآباد میں پہلی دفعہ
اس ڈرامہ میں نوکروں کے کرداروں کو دکھنی زبان دی گئی تھی۔ ڈرامہ اسٹیج پر
بہت کامیاب رہا۔ اور مخدوم کا پارٹ سب سے بہتر مانا گیا۔ رابندر
ناتھ ٹیگور ان دنوں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ سر اکبر حیدری جو وزیر اعظم
اور جامعہ عثمانیہ کے چانسلر تھے، ٹیگور کو ڈرامہ دکھانے کے لیے اپنے ساتھ
لے آئے۔ حاضرین کے علاوہ گرودیو ٹیگور کو بھی ڈرامہ بہت پسند آیا۔ اس
موقع پر سروجنی نائیڈو بھی موجود تھیں۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد مخدوم اور
میر حسن کا ٹیگور سے تعارف کرایا گیا۔ موصوف نے طلباء سے انگریزی
میں کہا کہ وہ تھوڑی بہت اردو سمجھتے ہیں مگر یہ ڈرامہ انھیں خوب لگا۔
زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طالبِ علم اتنا اچھا
ڈرامہ پیش کر سکتے ہیں۔ آخر میں گرودیو اسٹیج پر تشریف لائے اور حیدرآباد
میں پہلی دفعہ جن گن من سنایا۔ ٹیگور نے اس موقع پر مخدوم سے کہا تھا کہ وہ
جامعۂ عثمانیہ میں بی۔ اے مکمل کرنے کے بعد شانتی نکیتن (بنگال) آ جائیں۔
مخدوم کے دل میں گرودیو کی قائم کردہ اس درس گاہ سے فیض اٹھانے
کی خواہش جاگ اٹھی تھی لیکن مولوی عبدالحق چاہتے تھے کہ وہ جامعۂ
عثمانیہ ہی سے ایم اے کریں اور احباب انھیں چھوڑنا پسند نہیں کرتے

تھے۔

ڈرامہ "ہوش کے ناخن" اس کے بعد کئی بار اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد مخدوم کا لکھا ہوا ایک طبع زاد ایک ایکٹ کا ڈرامہ "مرشد" ساگر ٹاکیز کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ جس میں مرشد کا رول مخدوم نے ادا کیا تھا حضور نظام، رزیڈنٹ، مہاراجہ کشن پرشاد اور شاہی خاندان کے چند افراد خلاف پروگرام اچانک عین وقت پر تھیٹر پہنچ گئے۔ مولانا حسن نظامی اور مولانا شوکت علی بھی تماشائیوں میں موجود تھے۔ یہ ڈرامہ سب نے بہت پسند کیا اور مخدوم کی اداکاری کو سراہا گیا۔

اس کے علاوہ مخدوم نے ایک اور ڈرامہ "پھول بن" لکھا تھا جو چیخوف کے ڈرامہ کا ADOPTATION یہ ڈرامہ زمرد محل میں اسٹیج کیا گیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد مخدوم اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے ڈرامہ اور اسٹیج سے اتنے دور ہو گئے کہ انھوں نے کوئی اور ڈرامہ نہیں لکھا۔

مخدوم جب تک جامعہ میں رہے اپنی بذلہ سنجی، شوخی و شرارت حاضر جوابی اور اپنی ذہانت کی وجہ سے بے حد مقبول رہے۔ ان کی شرارت سے بھی ذہانت ٹپکتی تھی۔ مخدوم اور میر حسن کی لطیفہ گوئی، حاضر جوابی، اور دلچسپ شرارتوں اور ہوسٹل سرگرمیوں (Activities) کے قصے دور دور تک مشہور ہونے لگے۔ جامعہ عثمانیہ میں آئندہ کئی برسوں تک ان کی گونج سنی گئی۔ اور اب بھی حیدرآباد میں عثمانیہ کے

طیلسانئین ہی نہیں دوسرے لوگ بھی ان دلچسپ واقعات اورلطیفوں کے تذکرے کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مخدوم اور میرحسن کے زمانے میں چند مخصوص بے تکلّف دوستوں کی محفلوں میں ہجو گوئی بلکہ ہزل گوئی بھی جو بالعموم فی البدیہہ ہوا کرتی تھی، وقت گزاری اور قہقہوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔

یم اے کرنے کے بعد مخدوم تلاش معاش میں مصروف ہو گئے تقریباً دو سال مستقل ملازمت اور روزگار کی تلاش میں گزارے۔ ان ہی دنوں جامعۂ عثمانیہ میں اردو لکچرار کی ایک جائداد تقرر طلب تھی اس جائداد پر تقرر کے سلسلے میں مخدوم جامعہ کے وائس چانسلر قاضی محمد حسین سے ملنے کے لیے ان کے بنگلے پر گئے۔ اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ مخدوم کی بات سُن کر قاضی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور یہ شعر پڑھا ؎

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اس کے بعد انھوں نے کہا "تم اس جائداد کی چکر میں مت پڑو تمہیں اور آگے جانا ہے۔" وائس چانسلر کی اس ہمت افزائی پر مخدوم خوش تو ہوے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اُداس اور ملول بھی۔ کیونکہ انھیں جامعہ میں لکچرار کی جائداد نہیں ملی۔ اس زمانہ میں کچھ دنوں تک روزنامہ "پیام" اور دیگر اخبارات میں جز وقتی کام کرتے رہے۔ ریکارڈ آفس میں جہاں انھیں عارضی ملازمت ملی تھی۔ انھوں نے

دس ماہ یا ایک سال تک کام کیا۔

۱۹۳۹ء میں مخدوم کا سٹی کالج میں بہ حیثیت لکچرار تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک مخدوم ایک شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے اور حیدرآباد کے نوجوانوں اور طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ سٹی کالج میں طلباء کلاسوں میں تقریباً ہر روز فرمائشیں کر کے مخدوم کی نظمیں اور اشعار سنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ طلباء سیاسی اور فلسفیانہ مسائل اور موضوعات پر مخدوم سے سوالات بھی کرتے اور بحثیں بھی چھڑتیں۔

مخدوم نے اپنی نظم "اندھیرا" کلاس روم میں ہی لکھی۔ کلاس میں داخل ہونے کے بعد وہ لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔ مخدوم کی اس محویت کو دیکھ کر طلبا آخر وقت تک خاموش بیٹھے رہے۔ کلاس کا وقت ختم ہونے پر مخدوم واپس چلے گئے لیکن دوسرے روز جب وہ کلاس میں داخل ہوئے تو طلبا نے کہا کہ کل آپ نے جو چیز لکھی ہے وہ ہمیں سنائیے۔ مخدوم کو طلباء کی اس خواہش اور فرمائش پر اپنی تازہ نظم "اندھیرا" سنانی پڑی۔

مخدوم کو انکی نظم "انقلاب" پر علماء نے دکن کی جانب سے کفر کا فتویٰ ملا تھا۔ سٹی کالج کے پرنسپال محمد اعظم صاحب نے مخدوم کو بلوا بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ علماء کے اس فتوے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ مخدوم نے جواب دیا کہ اگر پرنسپال صاحب مناسب

بھجیں تو وہ علماء کو جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔ اعظم صاحب نے کہا کہ انھیں (مخدوم) اس بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے کی ضرورت نہیں اور پھر انھوں نے خود اپنی طرف سے علما کو جواب لکھ بھیجا۔

مخدوم نے سٹی کالج میں کوئی دو سال ہی تک کام کیا۔ اس دوران میں ان کے سیاسی رجحانات کا رنگ تیزی کے ساتھ ابھرتا جارہا تھا اور ان کی سیاسی مصروفیات روز بروز بڑھنے لگی تھیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے کالج کے ارباب مجاز بھی تشویش میں مبتلا تھے۔ شکایت یہ تھی کہ مخدوم اپنے لیکچر میں بھی اپنے سیاسی ایقانات کا بالواسطہ سہی لیکن موثر طور پر پرچار کرنے لگے تھے۔ مخدوم کے بعض احباب نے مخدوم کو صورت حال کی نزاکت سے واقف کرایا۔ مخدوم خود بھی پہلے ہی سے واقف تھے اور انھوں نے چند ہی دن کے اندر طے کرلیا کہ چاہے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور ساری عمر افلاس اور پریشانیوں میں گزر جائے مگر وہ کبھی اشتراکی خیالات و نظریات اور انسان دوستانہ رویہ نہیں بدلیں گے۔ اس صورت حال اور مخدوم کے عزائم سے واقف ہو کر ان ہی دنوں پارٹی نے فیصلہ کیا کہ پارٹی کے کام کے لیے مخدوم کی ہمہ وقتی خدمات حاصل کی جائیں۔ چنانچہ پارٹی کے کہنے پر انھوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنا استعفی پیش کردیا۔

مخدوم جب عملی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے ریاست حیدرآباد میں ہندوستان کی آزادی اور عوامی و کسان تحریکات کے لیے

چنگاریاں پیدا ہو چکی تھیں جد و جہد آزادی کے میدان میں دوسری دیسی ریاستوں کی طرح ریاست حیدر آباد بھی ملک کے دوسرے حصوں سے پیچھے تھی۔ مخدوم پہلے ہی سے شاہی اور مطلق العنانی کے خلاف اور نظام جاگیرداری و زمین داری کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حیدر آباد ہندوستان کی تحریک آزادی کی جد و جہد میں شریک ہو تاکہ ملک انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہو اور عوامی اور جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ حیدر آباد میں سوائے مجلس اتحاد المسلمین کے کسی سیاسی پارٹی کا وجود نہیں تھا کیوں کہ دوسری سیاسی پارٹیوں پر امتناع عاید تھا۔ اس وقت حیدر آباد میں آندھرا مہا سبھا، مہاراشٹرا پریشد اور کرناٹک پریشد تین عوامی تنظیمیں موجود تھیں لیکن یہ تنظیمیں تہذیبی تنظیمیں تھیں۔ سیاسی سرگرمیوں سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ مخدوم سٹی کالج کی ملازمت سے بہت پہلے ۱۹۳۴ء میں ہی باقاعدہ "پارٹی لٹریچر" کا مطالعہ شروع کر چکے تھے۔ اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے لٹریچر پر امتناع عائد تھا اور بڑی دقتوں سے ملتا تھا۔ مخدوم، ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو، اختر حسین رائے پوری، سبط حسن اور جے وی نرسنگ راؤ نے مل کر ایک مارکسٹ اسٹڈی سرکل قائم کیا۔ یہ تمام افراد سروجنی نائیڈو کے گھر پر ملا کرتے تھے جہاں بحث و مباحث ہوتے تھے۔ اس انجمن کے علاوہ حیدر آباد میں اشتراکی خیالات و نظریات رکھنے والے افراد کی

ایک اور بھی انجمن "کامریڈ اسوسی ایشن" تھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جواد رضوی، عالم خوندمیری، چھگرے، احسن علی مرزا اور اونکار پرشاد اس کے اراکین میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ روی نارائن ریڈی چند ساتھیوں کے ساتھ علیحدہ کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو ایک دوسرے کی معلومات، سرگرمیوں اور مقاصد کا علم نہیں تھا۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی سیاسی نصب العین کے لیے کام کر رہے تھے۔ مخدوم اور روی نارائن ریڈی پہلی بار ۱۹۳۹ء میں ایک دوسرے سے ملے۔ پہلی ملاقات میں دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ نظریات و خیالات پر بحث ہوئی اور لٹریچر کا تبادلہ ہوا۔ تب دونوں پر یہ بات واضح ہوئی کہ دونوں ایک ہی نوعیت کا کام کر رہے ہیں اور ان کا مقصد ایک ہے۔

حیدرآباد میں پوشیدہ طور پر ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا اور آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی سے اس کا الحاق کر دیا گیا۔ آندھرا مہاسبھا جو ایک تہذیبی تنظیم تھی اسے سیاسی تنظیم کے لیے استعمال کیا گیا اور بعد کو وہ ایک بڑی عوامی تنظیم بن گئی۔ حیدرآباد میں کمیونسٹ تحریک اس تنظیم آندھرا مہاسبھا کے ذریعہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد تک پہنچی۔ اس تنظیم کا اہم مقصد اور مطالبہ حیدرآباد میں عوامی اور جمہوری حکومت اور شاہی کا خاتمہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مخدوم شاہ آباد سمنٹ فیکٹری ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں شاہ آباد میں تھے کہ پارٹی کی جانب سے انھیں اطلاع ملی کہ ان کے نام گرفتاری کا وارنٹ نکلا ہے وہ روپوش ہوجائیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک روپوش رہے۔ ان کی روپوشی کے زمانے میں ہی حیدرآباد میں کمیونسٹ تحریک اور تلنگانہ جدوجہد نے اتنا زور پکڑا کہ اس کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پولیس ایکشن کے نتیجے میں ہندیونین میں شامل ہوا لیکن زمین دارانہ نظام کے خلاف تلنگانہ جدوجہد کے زور اور گرفت میں کمی نہیں ہوی۔ پولیس ایکشن سے قبل جدوجہد نظام شاہی کے خلاف تھی بعد میں کسانوں کے حقوق اور زمین داری کے خلاف ہندوستان میں اپنی طرز کی منفرد جدوجہد بن گئی کیوں کہ یہ جدوجہد مسلح تھی۔

حصول آزادی کے بعد ملک میں پہلی بار عام انتخابات ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوے۔ حیدرآباد میں کانگریس کے خلاف ایک عوامی جمہوری محاذ (PEOPLE'S DEMOCRATIC FRONT) قائم کیا گیا جس کے ارکان میں زیادہ تر کمیونسٹ اور دوسرے بائیں بازو کے عناصر تھے مخدوم حلقۂ شاہ علی بنڈہ سے اسمبلی کے لیے اور حلقۂ حیدرآباد سے لوک سبھا کے لیے امیدوار تھے۔ مخدوم کی رہنمائی اور ان کی عوام میں بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے عوامی جمہوری محاذ کو زبردست

طاقت ملی لیکن خود مخدوم اسمبلی اور پارلیمان کی دونوں نشستوں میں سے کوئی نشست حاصل نہ کرسکے بعد میں وہ اسمبلی کے لیے ضمنی انتخاب میں حضورنگر سے منتخب ہوئے۔ انتخابات جیتنے کے معاملے میں مخدوم ۱۹۵۶ء میں بھی بدقسمت ہی رہے۔ لیکن پارٹی نے انھیں قانون ساز کونسل آندھراپردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب کیا اور اب تک بھی وہ کونسل میں کمیونسٹ گروپ کے قائد ہیں۔ وہ ایک ممتاز ٹریڈ یونین لیڈر بھی ہیں۔ برسوں آندھراپردیش ٹریڈ یونین کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں۔ اپنی سیاسی مصروفیات اور ٹریڈ یونین تحریک سے وابستگی کے علاوہ مختلف تہذیبی اور ادبی اداروں تحریکوں اور امن تحریک سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ امن تحریک و مزدور تحریک کے سلسلے میں وہ روس، چین اور افریقہ، مشرقی یورپ اور مغربی یورپ کے کئی ممالک کا سفر کرچکے ہیں۔

ہمارے ملک میں ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا منظم طور پر آغاز ہوا۔ حیدرآباد میں اس تحریک کے تحت ادیبوں کی تنظیم اور انجمن کا قیام سخت مشکل مرحلہ تھا سبط حسن، مخدوم محی الدین اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو، ایم۔ نرسنگ راؤ اور دوسرے چند لوگوں نے مل کر حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ نوجوانوں میں اس تحریک نے زور

پکڑا لیکن قدامت پسندی، رجعت پسندی اور سیاسی مفادات کی بنا پر بعض حلقوں سے سخت مخالفت کی گئی۔ مخدوم ترقی پسند ادیبوں کے اس حلقہ کے روح رواں تھے۔ حیدرآباد میں ۱۹۴۳ء میں باقاعدہ طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے بعد ۱۹۴۵ء میں پہلی بار اردو کے ترقی پسند مصنفین کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد ہوی جو کہ اس انجمن کی سب سے زیادہ کامیاب کانفرنس مانی جاتی ہے۔ اس وقت تک حیدرآباد میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوگیا تھا اور حیدرآباد کی انجمن کو کافی فروغ حاصل ہوگیا تھا۔ مخدوم نے اگرچہ اپنی سیاسی اور ٹریڈ یونین کی مصروفیات کی بنا پر شعر کہنا قریب قریب ترک کردیا تھا لیکن پھر بھی وہ اس تحریک سے منسلک تھے اور آج تک بھی اس تحریک سے وابستہ ہیں۔

مخدوم کی شہرت اور مقبولیت فلم سازوں کو متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔ کئی فلم سازوں نے مخدوم سے اپنی فلموں کے گیت لکھوانے چاہے اور بعض فلم سازوں نے مخدوم کو بھاری معاوضے کے پیش کش کیے لیکن مخدوم نے عوامی زندگی کی اپنی مصروفیات سے کنارہ کشی قبول نہیں کی۔ البتہ وہ اس بات کے لیے تیار تھے کہ کبھی کبھار بمبئی کا رخ کرتے رہیں۔ چنانچہ آنجہانی بمل رائے نے ان کی یہ شرط قبول کرلی تھی۔ بمل رائے ٹیگور کے ایک ناول

کو فلمانے کے منصوبے بنا رہے تھے جن کے اسکرپٹ کی تیاری میں بھی وہ مخدوم سے کام لینا چاہتے تھے لیکن بمل رائے کے انتقال کی وجہ سے یہ منصوبہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ اس سے قبل بمل رائے اپنی فلم "اس نے کہا تھا" میں مخدوم کا گیت "سپاہی" پیش کر چکے تھے۔ فلم کے جن مناظر کے پس منظر میں یہ گیت رکھا گیا تھا ان میں اس گیت کی وجہ سے گہرائی اور تاثر پیدا ہوا تھا۔ آنجہانی گرو دت نے بھی "کاغذ کے پھول" اور اپنی اگلی دو فلموں میں گیت لکھنے کے لیے مخدوم سے اصرار کیا تھا لیکن مخدوم اپنی سیاسی اور ٹریڈ یونین سرگرمیاں ترک کرنے اور حیدرآباد چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے۔ ان ہی دنوں دیو آنند اور راج کھوسلہ نے مخدوم کی نظم "چارہ گر" کو اپنی کسی فلم میں پیش کرنے کے لیے حقوق حاصل کر لیے تھے لیکن انھیں موزوں سچویشن نہیں ملا۔ سنیل دت نے ان کی اجازت سے "چارہ گر" کا کچھ حصہ اپنی فلم "مجھے جینے دو" میں پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس نے حیدرآباد میں جب "آسمان محل" تیار کی تو اس میں بھی انھوں نے "چارہ گر" کے مختلف اشعار استعمال کیے۔ بعد میں چندر شیکھر نے اپنی فلم "چاچا چا" میں یہی نظم پیش کی۔

مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ "سرخ سویرا" ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "گل تر" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ انجمن ترقی

اُردو علی گڈھ ان کی نظموں کا انتخاب تین بار شائع کر چکی ہے۔ ان کی نظموں کا انتخاب دیوناگری رسم خط میں بھی ۱۹۵۸ء میں شائع کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں جب حیدرآباد میں جشن مخدوم منایا گیا تو اس موقع پر جشن مخدوم کمیٹی نے ان کا مکمل مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" کے نام سے شائع کیا جس میں "سرخ سویرا" اور "گل تر" میں شائع شدہ کلام اور بساط رقص کی تاریخ اشاعت تک کی تمام تخلیقات شامل ہیں۔ حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد سے شائع شدہ متعدد شعری تذکرے اور اردو شاعری اور ترقی پسند شاعری اور نئے شاعروں کے انتخاب میں بھی مخدوم کا کلام شامل ہے۔ جشن مخدوم کے موقع پر اردو کے ممتاز ادبی ماہنامہ "صبا" نے چار سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم "مخدوم نمبر" شائع کیا ہے جو مخدوم کی حیات اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض نظموں کے ترجمے ہندی، تلگو، مرہٹی، بنگالی اور بیرونی زبانوں انگریزی، روسی، جرمن اور چیک میں شائع ہو چکے ہیں۔

مخدوم کی شخصیت اور کردار پر زندگی کے وہ نشیب و فراز ابتدا ہی سے اثر انداز نظر آتے ہیں جن سے وہ گزرے جو باتیں اُن پر بیتیں جن مشکلات، غیر یقینی حالات اور جن واقعات سے وہ دوچار ہوئے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور کبھی کبھی یہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد بھی نظر آتے ہیں۔

مخدوم نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جس کا تعلق نچلے متوسط طبقے کے ایک شریف اور وضع دار خاندان سے تھا۔ والد اس وقت نوجوان تھے اور تحصیل میں صیغہ دار۔ جو کچھ کماتے خرچ کر دیتے۔ پیسہ ان کے ہاتھ میں ٹھہرتا نہیں تھا۔ مخدوم بہت چھوٹے تھے کہ باپ

کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مخدوم کو چچا کا گھر نصیب ہوا۔ اس گھر میں مخدوم نے ہوش سنبھالا۔ گھر کے حالات، چچا کے خیالات اور برتاؤ نے مخدوم کی شخصیت کی تعمیر میں حصّہ لیا اور مساوات، جمہور اور انسان دوستی کے اونچے تصوّرات اور قدروں کو انھوں نے اپنے چچا کی زندگی کردار اور گھر کے ماحول میں دریافت کیا۔ بچپن کے تاثرات دیرپا اور گہرے نقوش ثابت ہوتے ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی۔ یہ نقوش دھندلے نہیں، بلکہ اور بھی گہرے ہوتے گئے۔ اعلیٰ تعلیم، اچھی صحبت، ارباب علم و دانش کے ماحول، عمیق اور مسلسل مطالعہ کے ساتھ ان کی اپنی فطری صلاحیتوں نے ان نقوش کو اور بھی چمکایا۔ شاعر اور عوامی رہنما کی حیثیت سے جوں جوں مخدوم کا قد بلند ہوتا گیا ان کے اعلیٰ کردار میں بھی پختگی آتی گئی اور آج ان کا سارا ماحول، ان کے سب ہی دوست احباب اور رشتہ دار انھیں ایک خوددار، خوش مزاج، ملنسار سادگی پسند، مخلص اور مہربان شخص سمجھتے ہیں جس کے قول و فعل میں تضاد نہیں جو ہر ایک کی جائز مدد کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتا جو دوسروں کی برائی یا غیبت نہیں کرتا اور اگر دوسرے اس کی غیبت یا برائی کرتے ہیں تو مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ جو ہر حال میں خوش رہنا چاہتا ہے۔ بے غرضی اور اعلیٰ ظرفی کا وہ سچا نمونہ ہے۔ جدید انقلابی خیالات کا اور نئے رجحانات کا حیدرآباد کے تہذیبی ماحول میں اگر کسی اہم شخصیت نے جس کا اپنے ماحول، سماج اور تہذیب سے

گہرا تعلق ہو اپنی تہذیب کے اعلیٰ ورثہ، بلند اقدار اور شاندار روایات سے بہترین امتزاج کیا ہے تو بلاشبہ وہ مخدوم کی شخصیت ہے۔ مخدوم نے حیدر آباد کی تہذیب، آداب اور رکھ رکھاؤ کو اپنے انقلابی رجحان کے دھارے کے رخ پر بہہ جانے نہیں دیا بلکہ اپنی شخصیت کو اس تہذیبی ماحول کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کر لیا کہ آج حیدر آباد میں بہت سے لوگ جنھوں نے مخدوم کو قریب سے دیکھا ہے، مخدوم کو نئے حیدر آباد کی تہذیب اور زندگی کا ایک بہترین نمائندہ تصور کرتے ہیں۔ بہت کم شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں تہذیب اور ماحول کا رنگ اس درجہ سمویا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی ہی شخصیتیں اچھی تہذیبی روایات کو برقرار رکھنے، آگے بڑھانے اور چمکانے کا باعث بنتی ہیں حیدر آباد کی ایسی شخصیتوں میں مخدوم کا اپنا منفرد مقام ہے۔ حیدر آباد میں ایسے بھی لوگ ملیں گے جو مخدوم کو چاہتے ہیں لیکن اشتراکی طرزِ فکر کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ دہریت اور مادہ پرستی کا بڑے سے بڑا مخالف بھی مخدوم کے حلقۂ احباب اور "ہجومِ یاراں" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخدوم کے اندر جو انسان ہے اس کی کشش انھیں اپنی طرف بلاتی ہے۔ مخدوم نے سابق ریاست حیدر آباد بالخصوص شہر حیدر آباد اور تلنگانہ کے علاقہ میں شاعر اور عوامی و سیاسی رہنما کی حیثیت سے جو بے پناہ مقبولیت حاصل کی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ حیدر آباد میں مخدوم کے لیے

ایک ایک لاکھ کے بڑے بڑے اور دیوانہ وار ہجوم اور جلوس بھی دیکھے گئے۔ ان اجتماعات کے محبوب اور ہیرو مخدوم کی زندگی، کردار اور فن (شاعری) پر عوام کے اس خلوص اور پیار کی چھاپ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ مخدوم جانتے ہیں کہ انھیں چاہنے والے بے شمار ہیں۔ جواب میں وہ اپنے چاہنے والوں کو بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ چاہتے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود اور خدمت کو ہی اپنا مقصدِ حیات تصور کرتے ہیں۔ مخدوم اپنے چاہنے والوں ہی کو نہیں بلکہ زندگی کو بھی چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کو بہتر اور حسین بنانے کے لیے ایک شاعر اور عوامی کارکن کی حیثیت سے وہ اپنے اس منصب کو بھی پورا کریں جو زندگی اور تہذیب نے انھیں بخشا ہے۔ وہ اپنے اس فرض کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی گوارا نہیں کرتے اور شب و روز اپنے کام میں مصروف ہیں۔ انھوں نے زندگی، جدوجہد اور فن کو علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں نہیں بانٹا بلکہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مربوط رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں سے کسی کی انفرادیت کو بھی متاثر ہونے نہیں دیا۔ سیاسی تحریکوں کے جوش اور اُبال سے انھوں نے تاثر ضرور قبول کیا لیکن یہ اُبال ان کی شاعری میں کہیں پانی کا بلبلہ بن کر نظر نہیں آتا۔ اردو کے اہم شاعروں میں غالباً مخدوم ہی وہ شاعر ہیں، جو عوامی تحریکوں، کسانوں اور مزدوروں کی جدوجہد اور سیاسی ہنگاموں میں سب سے زیادہ شریک رہے ہیں

لیکن سیاسی نعرہ بازی سے انھوں نے اپنے فن کو ہمیشہ پاک رکھا۔ جب سیاسی ہنگاموں نے فرصت نہیں دی تو انھوں نے اپنے اندر کے فن کار (شاعر) کو کچھ عرصہ کے لیے چھٹی دے دی تاکہ وہ ان تاثرات کو اپنے تجربے میں سموکر موزوں وقت پر اشعار کی شکل دے۔ کچھ عرصے کے لیے شاعر "ساز پر سر رکھ کر سویا ہوا" نظر آتا ہے لیکن جب زمانے اور وقت نے اسے فرصت بخشی تو وہ دوبارہ نغمہ سنج ہو گیا۔

مخدوم کی سیرت اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے مختلف ادوار کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ عام زندگی میں ان کے رویے اصول اور اخلاق کے معیارات کا مطالعہ بھی کیا جائے۔

مخدوم بچپن ہی سے شریر تھے لیکن ان کی شرارتوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ اسکول پابندی سے جایا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی اسکول سے غائب رہ کر اپنے دوستوں کے ساتھ باؤلی میں تیرنے یا کھیتوں میں کھیلنے کے لیے چلے جاتے تھے۔ گھر پر ان سرگرمیوں کا پتہ چلتا تو چچا تنبیہہ کرتے اور پھر وہ پابندی سے اسکول جانے لگتے۔ وہ بچپن میں نہ تو ذہین اور غیر معمولی طالب علم تھے اور نہ محنتی۔ گھر پر چچا کی سختی اور نگرانی کی وجہ سے روز کچھ پڑھ لیتے تھے بڑوں اور بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے

اعلیٰ جماعتوں میں بھی مخدوم نے کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ ذہین تھے۔ انھوں نے جامعہ کے کسی

بھی امتحان میں درجۂ اوّل میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ جامعہ میں مخدوم اپنی طبیعت کی شوخی، شرارت اور بذلہ سنجی کی وجہ سے طلبا برادری میں بے حد مقبول رہے۔ ان کی ہر شرارت بامعنی، برجستہ اور ثقہ قسم کی ہوتی تھی۔ لطیفہ گوئی میں تو انھیں کمال حاصل ہے۔ جامعہ کے دور میں تو رات دیر گئے تک ان کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوا کرتیں۔ ہوسٹل میں رات کے دس، گیارہ یا بارہ بجے کے بعد مخدوم کے لطیفے شروع ہوتے تھے جب کبھی ان کے کمرے میں روشنی نظر آتی ہوسٹل کے ساتھی بے تکلف کمرے میں گھس آتے اور مخدوم سے لطیفے سنا کرتے۔ مخدوم نے جماعت میں کبھی استاد سے گستاخی نہیں کی اور ہمیشہ اساتذہ کے ادب اور احترام کا خیال رکھا مگر جب کبھی استاد سے کوئی قابل اعتراض حرکت سرزد ہوجاتی تو مخدوم کی بڑی بڑی اور چمکیلی آنکھوں میں شرارت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی جماعت میں درس کے دوران میں وہ نہ تو سوالات کرتے اور نہ اُستاد کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے۔ اساتذہ مخدوم کو کوئی معمولی طالب علم نہیں سمجھتے تھے۔ اگر کبھی اساتذہ کو مخدوم کی کوئی بات یا حرکت نامناسب معلوم ہوتی تو وہ راست مخدوم سے کہنے کی بجائے مخدوم کے کسی دوست سے کہہ دیتے کہ وہ مخدوم کو سمجھا دیں۔

جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے سے پہلے ہی مخدوم کی شادی ہوچکی تھی۔ شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جانے کی وجہ سے وہ ابتدا

یں کافی پریشان، ایک حد تک غیر مطمئن اور نالاں رہے کیونکہ اُن
کی معاشی حالت پہلے ہی سے ٹھیک نہیں تھی۔ ان باتوں کے قطع نظر
ان کی ازدواجی زندگی ابتدا ہی سے کامیاب رہی ہے۔ مخدوم کا رویہ
اپنی بیوی کے ساتھ مساویانہ اور دوستانہ ہے۔ مخدوم اور ان
کی بیوی میں خیالات اور نظریات کے اعتبار سے زمین آسمان
کا فرق ہے لیکن دونوں کی زندگی میں ہم آہنگی ہے۔ کسی نے مخدوم
کو بیوی سے ناراض یا ناخوش نہیں پایا یا انھیں بیوی کو ڈانٹ ڈپٹ
کرتے نہیں سنا۔ مخدوم کے پھوپھی زاد بھائی سید نظام الدین جو
ایک مذہبی، متقی اور پرہیزگار آدمی ہیں کہتے ہیں کہ" مخدوم کا بیوی کے
ساتھ رویہ اور ان کی گھریلو زندگی اور سیرت اولیاء اللہ اور بزرگوں
کی زندگی اور سیرت کا نمونہ معلوم ہوتی ہے" مخدوم گھر کی
ذمہ داریوں اور فرائض سے کبھی بے خبر نہیں رہتے وہ اپنی استطاعت
کے مطابق انھیں پورا کرتے رہتے ہیں لیکن گھر کے رہن سہن کے معیار
کو بلند کرنے اور بیوی بچوں کو زندگی کی بہتر آسائشیں مہیا کرنے
کے بارے میں کبھی توجہ نہیں کرتے۔ مخدوم کی گھریلو زندگی اور باہر
کی زندگی میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں۔ وہ اپنے خاندان
کے بڑوں اور بزرگوں کے ساتھ بڑی عزت اور احترام کے ساتھ
پیش آتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ ان کا سلوک بے حد مشفقانہ رہتا
ہے۔ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے بہت محبت اور خلوص

سے ملتے ہیں۔ مصروف زندگی کے باعث ایسا بھی ہوتا ہے کہ خاندان کے بہت سے افراد سے مدتوں بعد ملاقات ہوتی ہے۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے خاندان کی تقاریب اور سرگرمیوں میں بھی بہت کم شریک ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات بدگمانیاں اور غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور افرادِ خاندان ان کے خلوص پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔

ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ سب کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ دوستوں کی صحبتوں میں دلچسپ فقروں، لطیفوں اور برمحل اور برجستہ جملوں سے سب کو ہنساتے ہیں۔

مخدوم کی نظر میں سب انسان ایک ہیں۔ وہ انسانوں کو خانوں میں بانٹنے اور ان پر مختلف نام کے لیبل لگانے کے خلاف ہیں۔ مخدوم نے کبھی ہندو مسلم اور چھوٹے، بڑے کے سانچوں میں انسانوں کو نہیں رکھا۔ وہ عوام دوست اور سچّے انسانیّت پرست ہیں۔ اشتراکی طرزِ فکر کو اپنانے کے بعد اعلیٰ طبقے کی محفلوں میں انھیں دیکھ کر بعض لوگ اعتراض کیا کرتے تھے لیکن مخدوم نے اپنی ساری زندگی، اپنا دل و دماغ اپنی روح سب کچھ مزدوروں کسانوں اور عوامی تحریکات کے لیے وقف کر کے ان اعتراضات کو غلط ثابت کر دیا۔

اپنے مقصد کے حصول کے لیے خلوص، جانفشانی، بے باکی، اور بے غرضی نے انھیں بے انتہا شہرت بخشی۔ حیدرآباد میں شاعر کی حیثیت سے انھیں بے پناہ اور مثالی مقبولیت ملی۔ ہمارے ملک میں شاید ہی اردو کے کسی شاعر کو اس کے وطن میں اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں ہی اس درجہ مقبولیت[1] اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی ہو۔ مخدوم نے شاعر کی حیثیت سے ابھرنے کے بعد جو شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کرلی وہ سرخ سویرا کی اشاعت تک اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی وہ ہر مشاعرے میں بڑے شوق اور انہماک سے سنے جاتے ہیں اور سامعین کے اصرار پر باربار انھیں شہ نشین پر آنا پڑتا ہے۔ کرشن چندر نے حیدرآباد میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین (۱۹۴۵ء) کے رپورتاژ "پودے" میں مخدوم کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ دریافت کرنے پر کرشن چندر نے وضاحت کی کہ "مخدوم پورے حیدرآباد پر چھایا ہوا ہے۔ میں اس کا ذکر کرتا تو پھر اور کسی کا ذکر نہیں کرسکتا تھا۔"

مخدوم کے مزاج میں کہیں کہیں انتہا پسندی کا عنصر نظر آتا ہے۔ اشتراکی خیالات کو اپنانے کے بعد کچھ عرصے تک مذہب کی مخالفت میں ان کا رویہ انتہا پسندانہ رہا۔ بات چیت اور بحث و مباحثہ میں وہ مذہب کے خلاف سخت باتیں کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اشتراکی خیالات رکھنے والے تقریباً سب ہی دانشوروں کا طرزِ عمل

اور انداز فکر کچھ اسی قسم کا تھا۔ رفتہ رفتہ ان سب کے ساتھ مخدوم نے بھی اپنے لہجہ کا رویہ اور "جوشِ مخالفت" کو تبدیل کرلیا۔ اس معاملے میں اب وہ اس درجہ روادار بن گئے ہیں کہ نہ تو مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہیں اور نہ مذہبی تعلیم اور اصولوں کی پابندی کرنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد میں مخدوم کو ایک عہد آفریں شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنی شاعری، اپنے اندازِ فکر اور انقلابی خیالات کے ساتھ انھوں نے حیدرآباد کی عوامی اور تہذیبی زندگی میں ہلچل مچا دی۔ آج سے تیس سال قبل انھوں نے اس زمانہ کی نسل میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ روایت سے بغاوت، سائنٹی فک خیالات اور نظریات اور ان کی جدید شاعری نے حیدرآباد میں جو گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد حیدرآباد میں ابھرنے والے تقریباً سب ہی شاعر، ادیب اور دانشور اُن سے متاثر ہوئے۔ مخدوم کی اخلاقی جرات اور ان کے باغیانہ اور انقلابی ذہن نے نئی نسل کے مزاج اور ذہن پر جو اثرات مرتب کیے ہیں اس سلسلہ میں دو مشاعروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

۱۹۳۹ء میں جامعۂ عثمانیہ کے سالانہ جلسے کے سلسلے میں ایک مشاعرہ معظم جاہ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ

میں حصہ لینے والے تمام شاعر دستار لگائے ہوئے شریک ہوئے مخدوم نے نہ تو دستار لگائی اور نہ انھوں نے دوسرے شعرا کی طرح کلام پڑھ لینے کے بعد معظم جاہ کو سلام کیا۔ اس موقع پر انھوں نے نظم "قمر" سنائی تھی۔ معظم جاہ کے چہرے سے کچھ ناراضگی کا اظہار ہوا مگر انھوں نے خاموشی سے مخدوم کو سنا۔

سالار جنگ کی صدارت میں ۱۹۴۲ء میں گریجویٹس کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے ایک جلسے میں جس میں سالار جنگ کے علاوہ ظہیر یار جنگ اور سر اکبر حیدری موجود تھے مخدوم نے نظم "حویلی" پڑھی۔ جس میں انھوں نے پرانی حویلی" کی طرح بوسیدہ جاگیر دارانہ وزمین دارانہ سماج پر ضرب لگائی۔ اور اس معاشرے کے رکھوالوں کو " مارو کثر دم" سے تعبیر کیا۔ اس نظم کے سنانے کی سزا میں مخدوم پر عام جلسوں میں نظمیں سنانے پر پابندی عائد کردی گئی

مخدوم کی شخصیت میں بڑی جاذبیت ہے وہ صداقت پسندی اور خلوص کا پیکر ہیں۔ بحیثیت انسان مخدوم بڑے غیر معمولی انسان ہیں ان کی رفتار، گفتار اور طرز گفتگو میں غیر معمولی کشش ہے جو بھی ان سے ملتا ہے ان کی شخصیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی ہر بات میں خلوص ہوتا ہے۔ اس لیے ان سے ملنے پر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔

مخدوم نے اپنے سماجی یا سیاسی مرتبہ، اثر ورسوخ کو کبھی

ناجائز طور پر استعمال نہیں کیا۔ ایثار و قربانی کا مادّہ ان میں غیر معمولی حد تک پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ سے تعلق رکھنے والے اپنے تمام ہم عصروں میں مخدوم نے ہمیشہ تنگ دستی میں زندگی بسر کی۔ ان کے لیے بیسیوں بار ایسے مواقع آئے کہ اگر وہ چاہتے تو اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدے مل سکتے تھے مگر مخدوم نے ہمیشہ اپنے اُن اصولوں کو عزیز رکھا جنھیں وہ اپنا چکے تھے۔ تمام عمر تنگ دستی اور بے آرامی کی زندگی کاٹی لیکن کبھی انسان دوستی اور اشتراکی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو نہیں بدلا۔ آج حیدرآباد میں گنے چنے لوگ ایسے ملیں گے جن کی ہر شخص چاہے اس کا تعلق کسی فرقہ مذہب اور طبقے سے ہو عزت کرتا ہو۔ یہ غیر معمولی امتیاز مخدوم کو سالہا سال سے حاصل رہا ہے اور زمانے کا کوئی انقلاب اس کو متاثر نہیں کر سکا۔

شاعری کا ابتدائی دَور

محرکات اور ماحول

مطالعہ، تجربہ اور فطری صلاحیت مخدوم کی شاعری کے محرکات ہیں۔ مخدوم اپنے خاندان میں پہلے شاعر نہیں ہیں۔ مخدوم کے دادا کے برادر حقیقی (والد کے چچا) شاعر تھے۔

مخدوم نے آج سے تقریباً ۳۲ برس قبل جب کہ ان کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی، شاعری کا آغاز کیا۔ شعر کہنے سے قبل ہی انھیں اپنے پاکیزہ ذوق کی بدولت اس زمانے کے نامور شعرا کا کلام ازبر تھا اور اس کے علاوہ اساتذہ اردو فارسی کا بیشتر کلام بھی انھیں یاد تھا۔ وہ نجی محفلوں میں جو ان کے قریبی دوستوں میر حسن، نورالہدیٰ، اشفاق حسین اور ظفرالحسن پر مشتمل ہوتی تھیں دوسرے شعرا کا کلام خاص ترنم اور کیف کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ بالعموم

حسن نامی ایک دوست کے گھر پر ان احباب کی نشست ہوا کرتی تھی۔ ایک بار ایسی ہی ایک محفل پُر فضا ماحول میں منعقد ہوی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ مخدوم نے اختر شیرانی کی ایک شباباتی نظم اس درجہ دلکشی انداز میں سنائی کہ ساری محفل جھوم اٹھی۔ میراں صاحب اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوے کہتے ہیں کہ جب یہ نظم ختم ہوئی اور واہ واہ کا شور دب گیا تو انھوں نے مخدوم سے کہا ”تم نے شیرانی کی نظم سنا کر بڑا زبردست شاعرانہ ماحول پیدا کر دیا لیکن میرا خیال ہے کہ زیادہ شعریت تمہارے ترنم اور پیشکشی کے انداز میں ہے جس نے نظم کو بڑی اونچائی تک پہنچا دیا میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں شعر کہنا چاہئیے۔ تمہاری ہر ادا میں شاعری کا رنگ ہوتا ہے۔“ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ۱۹۳۳ء میں فرحت منزل (اقامت خانہ جامعہ عثمانیہ روبرو عدالت بلغ) پر اقامت خانہ کی سالانہ تقریب میں مخدوم کی مزاحیہ نظم ”پیالۂ شالہ“ بڑے اہتمام کے ساتھ قوالی کے انداز میں پیش کی گئی۔ حیدرآباد میں، یہ پہلا موقع تھا کہ قوالی کے انداز میں تفریح اور دلبستگی کے لیے ایک مزاحیہ نظم پیش کی گئی تھی۔ یہ نظم بہت پسند کی گئی۔ نہ صرف طلباء اور حیان بلکہ پرنسپال اور مودب اقامت خانہ بھی محظوظ ہوے۔ اس نظم کے بعض اشعار اور مصرعے زبان زد خاص و عام ہونے لگے۔ بعض مقامی اخبارات نے سالانہ تقریب میں نظم پیش کرنے کے قوالی کے انداز پہ

کافی لے دے کی تھی۔ لیکن اس سے نظم کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس زمانے کی مختلف تہذیبی محفلوں میں سامعین خواہش اور اصرار کے ساتھ "پیلا دُشالہ" سنا کرتے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ "پیلا دشالہ" مخدوم کی پہلی نظم ہے لیکن اس سے قبل وہ ایک اور نظم "بچے" لکھ چکے تھے۔ لیکن یہ نظم نہ تو کسی رسالہ میں شائع ہوئی اور نہ اب شاعر کے یہاں محفوظ ہے ابتدائی نظموں میں ایک اور نظم "نقاد" کا بھی یہی حال ہے۔ یہ نظم بھی شائع نہیں ہوی اور شاعر کو بھی یاد نہیں ہے۔

ابتدائی دور کی دو اور نظمیں "معمہ" اور "خواب بیداری" بھی مخدوم کے کسی مجموعہ میں شریک نہیں ہیں۔ یہ نظمیں مجلۂ جامعۂ عثمانیہ (مئی ۱۹۳۵ء) اور الاعظم ہفتہ وار ادبی نمبر (فروری ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوئی تھیں۔

نظم "معمہ" میں انسان اور کائنات کے آغاز اور انجام کے بارے میں شاعر کے ذہن میں کئی استفسارات ہیں۔ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو ازل سے آج تک انسان کے ذہن میں ابھرتے رہے ہیں کہ اس دنیا میں آنے سے قبل وہ کیا تھا اس کی تخلیق کیوں کر کی گئی ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔ یہ نظم جس زمانے میں لکھی گئی فاشزم کے زور اور ہٹلر کے عروج کا زمانہ تھا انسانیت کے مستقبل کے تعلق سے مختلف سوالات ذہن میں پیدا ہو رہے تھے

غلامی، غربت، نسلی امتیاز اور نفرت کی فضا عالمی سیاسیات پر چھائی ہوئی تھی۔ ان سوالوں کی گونج مخدوم کی اس نظم میں بھی ملتی ہے۔
اس نظم میں انسان کی تخلیق اور کائنات سے متعلق خیالات اسلامی عقیدے کے مطابق ہیں۔ انسان کی تخلیق کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

ملائک نے مجھے سجدہ کیا تھا
خلافت کا نشاں مجھ کو ملا تھا
خدا نے روح پھونکی تھی بدن میں
اُس کے خاص ہاتھوں سے بنا تھا

انسان کی اہمیت اور عظمت کے بارے میں ان کا خیال ہے:

بِلا میرے تھی بزمِ عرش پھیکی
یوں کہنے کو فرشتے تھے خدا تھا
نہ پوچھو کُن سے پہلے کون کیا تھا
میں بندہ تھا خدا تھا جو بھی تھا تھا

•

لیکن آدم کی اس عظمت کے باوجود اس کی زندگی، اس کی مجبوریاں اور بے بسی اور اس کے انجام کے بارے میں شاعر بہت غیر مطمئن ہے۔ انسان کی زندگی اور اس کے مستقبل کے

بارے میں شاعر کے ذہن میں کئی سوالات آتے ہیں اور کھٹکتے ہیں وہ اُن کا کوئی جواب نہیں پاتا اور خود آخر میں کہتا ہے :

کوئی بتلائے کیا ہونا ہے آگے
کوئی کہہ دے میں کیا ہوں اور کیا تھا

•

یہ نظم مخدوم کی ابتدائی نظموں میں سے ہے اور روایتی انداز میں ہے جس کے نمونے اقبال کی نظموں اور اصغر گونڈوی کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ان کی IDEALOGY کے مطابق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اسی لیے انھوں نے اس نظم کو مجموعہ میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا یا یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ خود شاعر نظم کے معیار سے مطمئن نہیں ہے۔

دوسری نظم "خواب بیداری" کا رنگ ٹھیٹ رومانی ہے خود مخدوم کے الفاظ میں "کچھ حقیقت کچھ فریب" ہے۔ نوجوان، وجیہہ اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے مخدوم اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں "پری چہروں" میں بھی پسندیدہ شاعر بن چکے تھے۔ اسی ماحول اس "جھرمٹ" اور اس "تبسم" اور "اشاروں" کا ذکر اس نظم میں شاعر کے تجربے میں رچا اور تصور پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعر اپنے آپ کو اس قدر حسین اور سحر انگیز ماحول میں گھرا ہوا پاتا ہے کہ اسے اپنی بیداری اور ہوش پر خواب اور فریب کا گمان ہو رہا ہے ؎

پری چہروں نے مجھ کو لے لیا ہے اپنے جھرمٹ میں
تبسم سے اشاروں سے بلاتے ہیں مجھے سارے
قیامت قامتاں مژگاں درازاں شوخ رفتاراں
شرارے چلبلے سیماب تن نوخیز مہ پارے

اس نظم کا آخری شعر بہت خوب ہے

کسی کی سانس کی گرمی مرے ہونٹوں کو چھوتی ہے
مری آنکھوں میں چھا جاتا ہے نشہ نیند کے مارے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے نظم کی فضا میں ڈوب کر یہ خوبصورت شعر موزوں کیا ہے۔

مخدوم کے طرز فکر پر مشاہیر عالم، بڑے لکھنے والوں، شاعروں اور قومی و بین الاقوامی تحریکوں کا اثر نمایاں رہا ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کا اثر ان کی شخصیت پر بہت گہرا پڑا۔ ہندوستان کی بڑی شخصیتوں میں رابندر ناتھ ٹیگور، جواہر لعل نہرو اور سروجنی نائیڈو سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ سروجنی نائیڈو ان سے بڑے پیار اور شفقت سے پیش آتی تھیں۔ وہ مخدوم کو اپنا بیٹا کہا کرتی تھیں۔ جب بھی مخدوم سروجنی دیوی کے گھر جاتے وہ ہمیشہ ان کی بیوی کے لیے بسکٹ، مٹھائی یا کھانے پینے کی دوسری چیزیں تحفتاً دیا کرتی تھیں۔

مخدوم نے اردو فارسی کے علاوہ بنگلہ، انگریزی اور روسی

شعرا کا بھی راست یا ترجمے کے ذریعہ مطالعہ کیا ہے اور ان کی شعری تخلیقات سے اثر قبول کیا ہے اپنی کاوشوں کے لیے ان تخلیقات سے انھوں نے INSPIRATION بھی حاصل کیا ہے لیکن ان کی شاعری میں کسی ایک کا رنگ نمایاں طور پر نظر نہیں آتا انھوں نے مختلف رنگوں سے اپنا ایک علحدہ رنگ بنا لیا ہے۔

اُردو شاعری میں جوش ان کا پسندیدہ شاعر ہے۔ مخدوم جوش کی شاعری میں حریت پسندی کے رجحان جوش و خروش اور ان کی توانائی کلامی کے قائل ہیں۔ جوش کے علاوہ اختر شیرانی کی رومانی شاعری، عظمت اللہ خاں کا نیا پن اور حفیظ جالندھری کے گیت بہت پسند تھے۔ ان کے علاوہ فانی کی غزلیں، اقبال کی بعض نظمیں، آزاد انصاری، ضامن کنتوری، اختر انصاری اور علی اختر بھی انھیں پسند تھے۔ حالی کی مسدس اور حالی کی پرانی غزلیں پسند تھیں۔ فارسی میں حافظ ان کا محبوب شاعر ہے۔ حافظ کے علاوہ خیام کو بھی بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور اور نذر الاسلام سے بھی وہ متاثر ہیں۔ ٹیگور پر انھوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا ہے۔ روسی شاعروں میں پشکن، میکاسکی اور یاسینن اور انگریزی میں شیلی، کیٹس اور بائرن انھیں پسند ہیں۔ ورڈس ورتھ کی "سادگی" پسند تھی۔ لیکن مخدوم کا کہنا ہے کہ اس کی شاعری نے انھیں INSPIRE نہیں کیا۔

اسپین کی جنگ اور انٹرنیشنل بریگیڈ کی تحریک سے بہت سے ہندوستانی نوجوان اور انقلابی شاعر اور ادیب بے حد متاثر ہوئے۔ مخدوم کی شاعری اور شخصیت بھی اس جنگ اور تحریک کے گہرے اثر کو قبول کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اسپین میں فاشزم کے خاتمے اور فرانکو کی مخالفت اور جمہوریت پسندوں کی حمایت میں جو جنگ لڑی گئی تھی اس میں تمام یورپ اور امریکہ کے ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں نے اسپین میں فاشزم کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے سخت جدوجہد کی تھی۔ جمہوری فوج کے تعاون کے لیے انٹرنیشنل بریگیڈ بنایا گیا تھا جس میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں اور دانشوروں نے امن اور آزادی کی جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا تھا اور محاذ جنگ پر اپنی جان کی قربانیاں دی تھیں۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی فاشزم اور جنگ کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے آمادہ کرنے اور دیگر ملکوں کے ادیبوں کی تحریک کا ساتھ دینے کے لیے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی جانب سے مہم چلائی گئی تھی۔

مخدوم نے انسانی فلاح اور بہبود، عدل و انصاف اور امن و امان سے متعلق خیالات، مارکس، لینن اور دوسرے اشتراکی مفکروں سے لیے لیکن طرز اظہار کو حسین اور موثر بنانے کے لیے انھوں نے اُردو اور فارسی کے شعرا کے طرزِ بیان سے استفادہ کیا۔

مخدوم نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی کسی کو اپنے سے اونچی سطح پر رکھ کر صلاح ومشورہ کیا۔ انھوں نے کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنایا۔ لیکن اگر کسی نوجوان میں صلاحیتیں دیکھیں تو اس کی ہمت افزائی ضرور کی۔

مخدوم جب فکر سخن کرتے ہیں تو سکوت اور خاموشی چھائی ہوتی ہے اور وہ خیالات میں گم ——

اس خاموشی میں ایک آواز اور لے جنم لیتی ہے اور نظم کا Leading مصرعہ نکلتا ہے اور اس کے بعد اس مصرعے کے اطراف پوری نظم بُنی جاتی ہے۔ انھوں نے اکثر نظمیں دس منٹ تا نصف گھنٹے میں مکمل کی ہیں۔ صرف ایک نظم "آج کی رات نہ جا" اقساط میں لکھی گئی۔ اس نظم کے ابتدائی مصرعے دیانا میں ہوئے اور اس کے ایک سال بعد جب وہ ویکاجی میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے اس نظم کے کچھ اور مصرعے موزوں ہوئے۔ دوسری صبح سوریا پیٹھ جاتے ہوئے کچھ مصرعے ہوئے اور اس طرح یہ نظم تین اقساط میں مکمل ہوئی۔

مخدوم نظمیں مکمل کرنے کے بعد بڑی تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔ خود اُن کے الفاظ میں انھیں یوں لگتا ہے کہ "بڑی تکلیف اور درد کے بعد بچّے کو جنم دیا ہے۔ وہ عام طور پر نظمیں لکھنے کے بعد سو جایا کرتے ہیں۔

"سرخ سویرا" کی شاعری

مخدوم ان چند ترقی پسند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھیں اپنی ابتدائی تخلیقات میں ہی اپنا انفرادی رنگ اور لب و لہجہ متعین کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مخدوم نے نہ صرف یہ کہ شاعری کی نئی سمت اور راہ کی طرف اشارہ کیا بلکہ اپنی شاعری اور اپنے پیام سے نئی نسل میں ایک نیا شعور اور نیا جذبہ پیدا کیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے ہم عصر شعراء شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی شاعری اور ان کے پیام سے متاثر رہے ہیں۔

مخدوم کے پہلے شعری مجموعے "سرخ سویرا" کی شاعری کو ان کے پہلے دور کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا دور تقریباً دس سال کی فکر سخن کا نتیجہ ہے "سرخ سویرا" کی

اشاعت ۱۹۴۴ء میں عمل میں آئی۔

مخدوم نے اپنی شاعری کی ابتدا نظم نگاری سے کی۔ عام طور پر اردو کے اکثر شعرا اپنی شعری تخلیقات کا آغاز غزل سے کرتے ہیں لیکن مخدوم کی جدت پسند طبیعت نے فرسودہ اور روایتی ڈگر پر چلنا گوارا نہیں کیا یا یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ اکثر انھیں اپنے مضامین کے لیے غزل کا سانچہ مناسب معلوم نہ ہوا ہو۔

" سرخ سویرا " کی شاعری کو رومانی اور انقلابی شاعری میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں رومانی اور انقلابی شاعری دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ رومانی شاعری ہو کہ انقلابی شاعری مخدوم ہر دو میں منفرد اور دلکش ہیں۔ ان کے یہاں خیالات کی ادائیگی میں پیچیدگی کو بالکل دخل نہیں۔

ان کی رومانی شاعری میں بڑی پاکیزہ اور معصوم فضا ہے۔ حسن و عشق کی گھاتوں، لطافتوں اور کیفیتوں کو انھوں نے شاعری کا نہایت دلکش جامہ پہنایا۔ عشق و عاشقی کے تجربات، مشاہدات اور واردات کو مخدوم نے اپنے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلے کہی ہوی باتوں، فرسودہ مضامین اور تجربوں کو مخدوم جب اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں تو بات کہنے کے سلیقے اور اسلوب کی شگفتگی کے باعث ان باتوں اور تجربوں میں کوئی

نئی بات پیدا کرتے ہیں یا کسی نئے پہلو کی دریافت ہوتی ہے۔

"سرخ سویرا" یا مخدوم کی ابتدائی نظموں میں مخدوم کے عنفوان شباب کے جذبات اور محسوسات کی جھلک نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ان جذبات میں ایک چھوٹتے ہوئے نالے کے بہاؤ کا جوش بھی ملتا ہے۔ لڑکپن کی معصوم اور پاکیزہ وابستگیوں اور عنفوان شباب کے تصور اور جذبہ حسن و عشق کی شوخی اور طراری بھی نظر آتی ہے۔ ان نظموں میں بیان کردہ جذبات اور محسوسات کا تعلق مخدوم کی عمر کے اس موڑ سے ہے۔ جہاں ان کو "حرف مدعا" کے اظہار کی جرأت ہوئی تھی اور جہاں "محبت کے سبق کی ابتدا" ہوئی تھی۔

اس مجموعہ کی پہلی نظم "طور" مخدوم کی ایک اچھی اور خوب صورت رومانی نظم ہے۔ جس میں شاعر نے اپنی داستان ماضی یا محبت کی معصوم یاد کو شعر کا قالب پہنایا ہے۔ اس نظم کے طرز بیان میں بڑی تازگی اور جدت ہے جس کی وجہ سے یہ گماں ہوتا ہے کہ عشق کی واردات میں بڑی حقیقت اور واقعیت ہے۔

اپنی محبت کے بارے میں ایک بند میں کہتے ہیں۔

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی

ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزلخواں حور ہوتی تھی

●

"طور" میں جو منظر کھینچا گیا ہے وہ بڑا دلکش ہے۔ جذبات لطیف ہوتے ہوئے بھی اتنے شدید ہیں کہ "خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے۔ جیسی بات بھی شاعر کے دل سے نکل جاتی ہے۔

دلوں میں اژدھام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

آخری شعر میں مخدوم نے عیش رفتہ نہ کہا ہوتا تو بہتر تھا۔

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عیش رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

"عیش رفتہ" لکھ کر مخدوم نے نظم کے معصوم، پاکیزہ اور رومانیت و شعریت سے بھرپور آب رواں کی لہروں پر ناگوار انداز میں ایک پتھر پھینکا ہے۔

"انتظار" مخدوم کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے۔

اس نظم میں شروع سے آخر تک ایک فضا اور کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ یہ انتظار محبوب کا بھی ہے اور "تمناؤں کے خواب" کا بھی جسے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی اصطلاح میں نئی صبح کے طلوع اور انسانیت کے اچھے اور تابناک دور کے آغاز کا خواب سمجھا جاتا ہے۔ انتظار کے "خواب تمنا" کی یہ تعبیر خود شاعر مخدوم نے بھی کی ہے جب ان سے اس بارے میں خود ان کا اپنا تاثر جانا گیا۔

"انتظار" میں شاعر سراپا انتظار رہے۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

محبوب کا انتظار ہو رہا ہے اور اس امید کے ساتھ

نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

انتظار کی تڑپ اور بے چینی میں ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے ہیں ؂

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

بات کہنے کا یہی انداز اور ان کے کلام کی یہی دل نشینی مخدوم کے کلام کو ندرت بخشتی ہے لیکن جب وہ نہیں آیا تو شاعر

کے سامنے یہ اندیشہ ابھرنے لگا کہ اب وہ آئے گا نہیں اور یہ اندیشہ اس غم ناک تمنا کا روپ اختیار کر لیتا ہے کہ ؎

آ بھی جاتا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جاتا کہ ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

"لمحۂ رخصت" میں شاعر نے لمحات رخصت کی قلبی کیفیت کو شعر کی زبان دی ہے۔ اس نظم میں بلا کی شعریت ہے۔ رخصت ہوتے وقت آنکھوں، باہنوں، پلکوں، ہونٹوں، زلفوں اور نگاہوں پر کیا گزری اس کا بیان دل نشین انداز میں ملتا ہے۔ تجربۂ مشاہدہ کے ملے جلے رنگ سے اچھی منظر کشی بھی اس نظم میں ملتی ہے۔

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا باہنوں میں

•

شانے پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کاکل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

•

"یاد ہے" میں شاعر اپنی نوجوانی کا زمانہ یاد کرتا ہے جب کہ اس کی زندگی امنگوں، پر شوق ترانوں اور نغموں سے معمور تھی۔ وہ حُسن کی ہر ادا پر نثار ہوتا تھا اور دل اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بے قرار رہا کرتا تھا وہ خوشی اور مسرت میں اس طرح گھرا

رہتا کہ اسے یوں لگتا کہ سارا جہاں مسرور تھا لیکن جب رات آتی تو اپنے ساتھ درد کا پیام ساتھ لاتی اور وہ لذت کے مزے سے آشنا ہوتا تھا۔ اس نظم کا رومانی ماحول خیالی نہیں حقیقی ہے اور مشاہدے اور تجربے کی بنیاد ہے۔ اس نظم کے جذبۂ عشق میں سوز و گداز اور وارفتگی بھی ملتی ہے۔

رات آتی تھی ستانے سوز کا پیغام جب
مشق تحریرِ جنوں بنتا تھا ترا نام جب
تھا نہ کچھ پیشِ نظر اس عشق کا انجام جب

یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

"جوانی" میں مخدوم عنفوانِ شباب کے امڈتے ہوئے جذبات اور احساسات کا بلاجھجک اظہار کرتے ہیں۔ اس نظم میں اور "سرخ سویرا" کی شاعری میں اور بھی کئی مقامات پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلے دور کی شاعری شاعر کے جنسی جذبات اور ہیجان کو بھی ظاہر کرتی ہے لیکن مخدوم نے جلبی جذبات کو شاعرانہ انداز میں ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ جنسی بے راہ روی یا ضرورت سے زیادہ جنسی آزادی کا رجحان جو اس زمانے میں اور اس کے بعد کے جدید ادب و شاعری بالخصوص افسانوں میں ملتا ہے مخدوم کے پاس قابلِ اعتراض شکل میں نظر نہیں آتا۔

جوانی کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے ؎

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بند قبا تنگ
ساغر کی کھنک بن گئی اس شوخ کی آواز
اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں

مذکورہ بالا مصرعے شاعر کے احساس جمال سے زیادہ جنسی جذبے کو ظاہر کرتے ہیں۔ مخدوم نے جب شاعری شروع کی تو ان کی عمر (۲۵) سال ہو چکی تھی لیکن شاعری میں پیش کرنے کے لیے جو گہرے نقوش باقی تھے وہ لڑکپن اور آغاز جوانی کے تجربات اور احساسات ہی کا نتیجہ تھے۔

"آتش کدہ" میں شاعر دلبران خاص کی محفل اور حسینوں کی محفل میں ہے۔ وہ دلبرانِ خاص اور حسینانِ محفل اس کے نشے میں چور ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کتنی ہی نو آغاز کلیوں اور کتنے ہی خوشبودار پھولوں کا محبوب تصور کرنے لگتا ہے۔ شاعر اس نظم میں حُسن کی بے اعتنائی اور بے وفائی پر نوحہ خواں نہیں۔ اس کی انا کا تو یہ عالم ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ہی حسینوں اور مہ وشوں کا مرکز سمجھنے لگا ہے۔

کتنی نو آغاز کلیاں کتنے خوشبودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول

کتنے سنگین دل ہیں جو میرے نشے میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں

سرخ سویرا کی رومانی شاعری میں ایک معصوم اور پاکیزہ فضا ضرور ملتی ہے لیکن وہ قلبی جذبات جو لازمہ عشق ہیں کم سے کم ہیں ان کے عشق کی گرمی جنوں اور وحشت کی شکل اختیار نہیں کرتی۔ ان کے یہاں اضطراب، وحشت اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیت بھی نہیں ملتی۔ انھوں نے عشق اور عاشقی کے جذبات اور تجربات کو اپنے اچھوتے انداز میں بیان ضرور کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عملی تجربہ عشق سے دوچار ہی نہیں ہوئے وہ عشق کے معاملے میں Realist نظر نہیں آتے یہ احساس نہیں ہوتا کہ واقعی انھوں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ عشق کیا ہو۔ البتہ اس تجربے کی خواہش اور تمنا ضرور ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شاعر کی حیثیت سے کسی بھی تصویر حُسن کو مرکز نگاہ بنانے میں ناکام رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کسی ایک محبوب کا کردار مسلسل نظر نہیں آتا۔ حسن کے مختلف جلوؤں سے شاعر کی آنکھیں چکاچوند ہونا چاہتی ہیں۔ مختلف اور متضاد عشوؤں اور اداؤں سے وہ مختلف حالات اور موقعوں پر متاثر نظر آتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مخدوم کا عشق خیالی اور غیر حقیقی ہے تو ان کے لیے کس طرح ممکن تھا کہ کسی خاص

شخص سے عشق کیے بغیر محبت اور محبوب کے حسن وجمال کے نغمے یا ترانے گاتے یا عشق کے بغیر موثر طریقے پر عاشقانہ جذبات کا اظہار کر سکتے۔

اس سلسلے میں ہمیں کہنا یہ ہے کہ شاعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے ہر شعر یا شعری تخلیق میں اپنی زندگی کے کسی تجربے یا واقعہ کو ہی بیان کرے۔ شاعر کی قلبی دنیا بڑی عجیب ہوتی ہے اور اس دنیا میں گم رہنے والا شاعر بعض اوقات اپنے تخیل اور وجدان کے زیر اثر جو فکر کرتا ہے اور بیان کرتا ہے، اس میں واقعیت اور حقیقت کے رنگ بڑے انوکھے انداز میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس کا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتا ہے وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے خیالوں کو چھو رہا ہے دیکھ رہا ہے۔ مخدوم شعر کہتے وقت بھی اور شعر سناتے وقت بھی اپنے اشعار کی فضا میں کھو جاتے ہیں۔

محبت اور حسن وجمال کے نغمے اور ترانے گانے کے لیے عشق کرنے کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ کسی خاص شخص سے عشق کیے بغیر حسن وجمال کے ترانے گائے جا سکتے ہیں اور عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ عشق انسانی فطرت کا لازمی جز ہے۔

مخدوم کا عشق کوئی روایتی اور ماورائی عشق نہیں۔ ان کا عشق فطرت انسان کے عین مطابق ہے۔ ان کا عشق جنسی

اور جسمانی آرزوؤں کی تکمیل چاہتا ہے۔ لیکن جذبۂ عشق کا اظہار سطحیت اور عامیانہ روپ نہیں اختیار کرتا۔

ان کا محبوب گوشت پوست کی حقیقی اور مادی شکل میں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا کوئی ایک محبوب نہیں بلکہ کئی محبوب ہیں۔ کبھی کھیتوں میں پانی کے کنارے ان کی "خلوت معصوم رشک طور ہوتی ہے" تو کبھی "سجدہ" میں انھیں اس پیکر شرم و حیا کا خیال آتا ہے۔ جو آنچل میں منہ چھپائے ہوئے ہے۔ آتش کدہ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت تک شاعر نے کسی خاص محبوب سے محبت نہیں کی۔ مختلف خیال اس کے دل و دماغ میں اور مختلف جلوے اس کی نظر میں رہے۔

بعد کی انقلابی نظموں میں یا پھر ایسی نظموں میں جہاں رومانی اور انقلابی شاعری ایک نقطہ پر آکر مل جاتی ہے ان کے خالص جذبۂ عشق و وارفتگی کا اظہار ملتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عوامی جدوجہد سے ان کی وابستگی سچے دل کے ساتھ گہری اور والہانہ وابستگی ہے۔ انقلاب کو وہ اپنا محبوب اور مقصود سمجھتے ہیں تو اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ اسے چاہتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں اس کے خواب دیکھتے اور اپنے اشعار کے ذریعے دکھلاتے اور بیان کرتے ہیں۔ ابتدائی دور کی رومانی نظمیں اس شدید جذبہ و احساس اور جوش و وارفتگی سے بڑی

حد تک عاری نظر آتی ہیں۔ ان میں خواب ادھورے ہیں اور تمنا گہرے نقوش چھوڑتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ سچی اور دلی وابستگی، بے لوث تعلق، اپنے محبوب سے قریب ہونے اور اسے پانے کی جستجو اور تڑپ ان نظموں میں ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ اس کے نقش ملتے بھی ہیں تو لڑکپن کی شوخی و شرارت سے معمور معصومانہ فضا اور ماحول میں کھینچی گئی لکیروں اور مٹی پہ بنائے ہوئے مٹی کے گھروندے کی شکل میں ـــــ ان رومانی نظموں میں وہ اپنی داستان عشق خون دل میں انگلیوں کو ڈبو کر نہیں لکھتے۔

حقیقی اور مکمل تجربے کی کوئی اکائی بھی ان کی ابتدائی رومانی نظموں میں بہت کم ملتی ہے۔ بالعموم ان کی نظم میں واردات و محسوسات کے بیان اور تخیل کی اٹھان سے متعلق ترتیب اور تنظیم کے عمل میں کہیں اچانک خلا پیدا ہو جاتا ہے تو کہیں فضا تبدیل ہو کر پردہ وہاں گرتا ہے جہاں اسے گرنا نہیں چاہیئے جہاں خیال اور منظر اپنے نقطۂ عروج اور تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں مخدوم کی تیار کی ہوئی رومانی فضا کی چند جھلکیاں ہی دیرپا اثر چھوڑتی ہیں اور یاد رہ جاتی ہیں بقیہ مناظر تیزی کے ساتھ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اس کے برخلاف رومانی

انقلاب کے امتزاج اور انقلابی شاعری میں پیدا کردہ کیفیت زیادہ شدید بھرپور اور مقابلتاً گہرے اثرات مرتب کرنے والی کیفیت ہے

مخدوم کی انقلابی شاعری کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں اس عہد اور ماحول پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ جس میں مخدوم کی شاعری نے آنکھ کھولی کیونکہ ادب اور شاعری بہرحال ایک سماجی عمل ہیں۔ ادب اور شاعری زندگی سے الگ خلاء میں سانس نہیں لے سکتے۔ سماجی زندگی میں جو تغیر اور تبدیلی اور جو نئے تجربے ہوتے ہیں، ان کی ترجمانی ادب اور شاعری میں ہوتی ہے۔ یہ ترجمانی قدیم روایات سے انحراف اور نئے رُجحانات اور نئے خیالات کے اظہار کی ہوتی ہے۔ مخدوم کی انقلابی شاعری پر نگاہ ڈالنے کے لیے سب سے پہلے تو خود اردو شاعری میں سیاسی اور انقلابی شاعری کی روایت کا سرسری جائزہ لینا ہوگا۔

اردو میں سیاسی اور انقلابی شاعری ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات کی دین ہے۔ اس جنگ آزادی نے ملک کے ہر طبقے کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو متاثر کیا تھا اردو میں نظم اور نثر کے لیے اب گل و بلبل اور معاملات حسن و عشق کی فضا سے نکل کر کھلی فضا میں زندگی کے رنگ ڈھنگ کا احساس اور زندگی کی دھڑکنوں کو اپنے اندر سمونا ضروری ہوتا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے حالی نے سیاسی نظمیں لکھیں۔ ان کے

ہم عصروں میں شبلی اور آزاد نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان سب کی شاعری میں اصلاح نصیحت اور تلقین کا رنگ نمایاں تھا۔ بعد میں اقبال نے سیاسی شاعری کو فکر و خیال کی بلندیوں سے روشناس کرایا۔ انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے معنی میں سب سے پہلے اقبال ہی نے استعمال کیا۔ اقبال نے ہی اردو شاعری کو سیاسی انقلاب کا تصور بھی عطا کیا۔ پھر جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کی انقلابی نظموں نے جن میں آتش سیال کا سا جوش اور ابال ہے، اردو کے تمام نوجوان شعرا کو متاثر کیا۔

۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۰ء کے دور تک اصلاح پسندی اور رومانیت پر حقیقت پسندی غالب آچکی تھی۔ یہ دس سال اردو کی ادبی تاریخ میں اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ غدر کے بعد کا دور جبکہ سرسید اور ان کے رفقا نے ہماری ادبی تاریخ میں پہلی بار معقولیت پسندی کے تقاضوں کو ادبی تخلیق کا رہبر بنایا تھا۔ عوام کا جذبۂ آزادی، بیرونی سامراج کے خلاف نفرت کا شدید احساس، سماجی انصاف اور معاشی مساوات کے نئے تصورات جو یورپ سے نئے ہندستانی نوجوان ادیبوں کے ذریعہ ہندوستان میں داخل ہو چکے تھے۔ ان سب نے اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ افسانہ، ناول، تاریخ اور تنقید وغیرہ میں تنوع، گہرائی اور وسعت پیدا کر دی تھی۔ اور اب اردو کے یہاں عظیم عشقیہ شاعری ہی نہیں تھی بلکہ حالی، اقبال اور جوش

جیسے باکمال شعرا کی جدید شاعری بھی تھی۔

مخدوم کی شاعری کا آغاز تاریخ ادب کے اسی موڑ سے ہوا۔ اس لیے ان کی شاعری میں ابتدا ہی سے جذبات اور عقلیت پسندی کا امتزاج نظر آتا ہے وہ فقط انقلاب پسند بن کر تخریب دہشت کے زیر اثر سب کچھ ختم کر دینے کی باتیں نہیں کرتے۔ نئی زندگی اور نظام نو کی بشارت بھی دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ابتدائی شاعری میں کہیں کہیں جھنجلاہٹ، دہشت پسندی اور گریز کی چھاپ ملتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی جلد اپنے جذبات پر قابو پالیتے ہیں اور سائنٹیفک انداز میں زندگی، سماج اور طبقاتی کش مکش کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اپنے ہم عصر نوجوان شعرا کے مقابلے میں مخدوم کا راستہ زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا اور اس دشوار گزار راستے پر تنہا انھیں آگے بڑھنا تھا۔ مخدوم نے جس ریاست میں اپنی شاعری یا شعلہ نوائی کا آغاز کیا، وہ سیاسی اعتبار سے ایک پسماندہ دیسی ریاست تھی جہاں شاہی اور فرسودہ جاگیرداری نظام کو باقی رکھنے اور پائیدار بنانے میں برطانوی شہنشاہیت، مقامی جاگیردار اور مذہبی احیا پسندوں کے گروہ مل کر کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت جبکہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں عوام آزادی کا حق مانگ رہے تھے اور آزادی کی تحریک کا ناطہ بین الاقوامی تحریکوں سے جوڑا جا رہا تھا

اس وقت حیدرآباد میں آزادی کا نام لینا بھی جرم تھا۔ رجعت پسند اور دقیانوسی خیالات کو ابھارا جارہا تھا کہ عوام آزادی اور جمہوریت کے نئے نعروں اور رجحانات سے دور رہیں۔ قومی اتحاد اور متحدہ جدوجہد میں رخنے ڈالے جارہے تھے۔ ریاستی عوام ملک کے دوسرے حصوں کے عوام سے الگ کیے جارہے تھے۔ مخدوم کے ہم عصر نوجوان شعراء فیض، مجاز، علی سردار جعفری اور جذبی وغیرہ کا سامنا برطانوی شہنشاہیت اور اس کی معاشی اور سیاسی استبداد سے تھا۔ بین الاقوامی سطح پر وہ جنگ اور فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے سے برسرپیکار تھے۔ لیکن مخدوم کا تعلق ان سب باتوں کے علاوہ حیدرآباد جیسی پسماندہ دیسی ریاست کے تنگ اور گھٹن پیدا کرنے والے ماحول سے تھا۔ جسے وہ "بوسیدہ حویلی" کا ماحول تصور کرتے تھے۔ نئی فضاؤں میں سانس لینا ان کے لیے زیادہ جرأت کی بات تھی۔

انقلابی اور سماجی شاعری کی روایات کو آگے بڑھانے میں مخدوم کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ "سرخ سویرا" کی مختلف نظموں میں وہ سماج اور سامراج کے باغی، نئے اور اچھوتے نظام کے خالق اور مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے دردمند اور ہمدرد نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں ہندوستان کی غریبی بھوک اور بے روزگاری کے خلاف احتجاج، ہندوستان کی آزادی کی خوش آئند مستقبل کے بارے میں

اشارے ملتے ہیں وہ اشتراکی نظام کو انسانیت کی نجات کا ذریعہ اور سرمایہ داری کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔

مخدوم کی پہلی انقلابی نظم "باغی" ہے۔ جس میں ماحول سے بیزاری اور جوشِ تخریب کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی دنیا بنانے کی باتیں موجود ہیں۔

برق بن کر بت ماضی کو گرانے دے مجھے
رسم کہنہ کو تہ خاک ملانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خواب فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے

اس نظم میں شاعر ظلم و جبر سرمایہ داری اور غربت سے دنیا کو چھٹکارہ دلانا چاہتا ہے۔ "باغی" کا لب و لہجہ اور اس کا جوش دہشت پسندانہ ہے۔ وہ آگ لگانے اور جلا کر خاکستر کر دینے پر تلا ہوا ہے ؎

میری فریاد پر اہل دِل انگشت بہ گوش
لا تبر خون کے دریا میں نہلانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ہاں اک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس آگ لگانے دے مجھے

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ باغی اور بغاوت کی اصطلاحیں قاضی نذرالاسلام اور جوش کی شاعری کے ذریعے عام ہو چکی تھیں،

قاضی نذرالاسلام کی ایک بنگالی نظم کا عنوان "باغی" ہے۔ جوش نے اس سے متاثر ہو کر اپنی نظم "بغاوت" لکھی۔ مخدوم کی نظم "باغی" کا بھی وہی لہجہ اور آہنگ ہے۔

"موت کا گیت" مخدوم کی ابتدائی انقلابی نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم مخدوم کے باغیانہ خیالات اور جوش کی حامل ہے شاعر سرمایہ دارانہ نظام اور غلامی کو تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ وہ "دو عالم کو دگرگوں" اور "قلب گیتی" میں تباہی کے شرار سے بھر دینا چاہتا ہے ؎

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

وہ تمام طوفانی اور تخریبی قوتوں کو آواز دیتا ہے ؎

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاوؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کُرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

ان نظموں میں جذبات کا سیلاب اور غیض و غضب کی فراوانی ہے۔ شاعر کا لہجہ بڑا تلخ اور سخت ہو گیا ہے۔ اسی بنا پر بعض تنقید نگاروں نے اس دور کی شاعری پر دہشت پسندی کا

الزام لگایا ہے۔

"سرخ سویرا" کی تقریباً تمام اہم سیاسی اور انقلابی نظمیں ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک یعنی سات سال کے دوران میں لکھی گئیں جنگ، مشرق، حویلی، انقلاب، اندھیرا، زلفِ چلیپا اور استالین مخدوم کی اچھی اور کامیاب سیاسی اور انقلابی نظمیں ہیں۔

"جنگ" مخدوم کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ فاشزم کی امن شکن طاقت دنیا کو جنگ کی آگ میں ڈھکیل دینا چاہتی تھی۔ یورپ کی سامراجی طاقتیں فاشزم کو طاقت ور اور مضبوط بنا رہی تھیں ہندوستان برطانیہ کا غلام تھا۔ اسی وجہ سے ہندوستانی عوام، حبشہ کی آزادی کی حمایت کرنے کے باوجود بیرونی تسلط کی وجہ سے حبشہ کی تحریکِ آزادی کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ حبشہ پر مسولینی کے حملہ کے بعد مخدوم نے اپنے شدید ردِّ عمل کا اظہار اپنی نظم "جنگ" میں کیا انھوں نے جنگ کے "پس پردہ عفریت سیم و زر" کو کارفرما دیکھا۔ جنگ کی تباہیوں کو محسوس کیا۔ اور "انسانیت کے خون کی ارزانیوں" کا ماتم کیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ جذبات کی بے پناہ شدت کا شکار ہو گئے ہیں لیکن جنگ سے بیزاری اور نفرت کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی دنیا کی تخلیق کی تڑپ موجود ہے۔

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انسان رہ سکے کوئی ایساں جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے
او آفتاب رحمت دوران طلوع ہو
اور انجم حمیت یزداں طلوع ہو

"مشرق" مخدوم کی کامیاب انقلابی نظم ہے۔ جس کا لب و لہجہ اور تیور بالکلیہ انقلابی نظموں کا ہے۔ شاعر کی اپنے ماحول سے شدید بیزاری اور نفرت نے اس نظم میں بڑی حرارت اور اشتعال پیدا کیا ہے۔

مخدوم نے یہ نظم اس دور میں کہی جب مشرق کی عظمت کے گن گائے جا رہے تھے لیکن مشرق کی بھوک، فاقہ، افلاس اور جہالت کی طرف نگاہ نہیں ڈالی جاتی تھی۔ مغربی، سامراجی اور نوآبادیاتی طاقتوں کی طرف سے مشرق کی روحانیت اور مشرق کے عظیم ماضی کی تعریف کا مقصد یہ تھا کہ مشرق کے لوگ اس تعریف کے نشہ میں مخمور ہیں۔ سامراجی استحصال اور لوٹ کھسوٹ پر ان کی نظر نہ جائے اس مصنوعی فضا میں تقدیر پرستی کا رجحان مشرق میں عام ہو چلا تھا مخدوم نے اپنی اس نظم میں حقیقت پر سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی اور بڑی گہری نظر اور مختلف زاویوں سے مشرق کا مطالعہ کر کے بتایا کہ مشرق کی یہ تصویر بھی ہے۔

جہل، فاقہ، بھیک بیماری نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی عقل و فراست کا مسان
دیمک زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

یہ ہے اس مشرق کی حقیقت جہاں کے لوگ اپنی حقیقت سے بے خبر جھوٹی شان اور پرستش میں مصروف تھے لیکن شاعر کے نزدیک وہ ایک ننگی بے گور و کفن نعش ہے جو مغربی چیلوں کا لقمہ ہے۔ شاعر کے خیال میں وہ ایک ڈھانچہ ہے

پیکرِ ماضی کا ایک بے روح اور بے رنگ خول
ایک مرگ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

بڑی نفرت اور بیزاری کے ساتھ مشرق کی تصویر کھینچنے کے باوجود شاعر مایوس نہیں بلکہ بڑے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ کہتا ہے ؎

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

نظم "حویلی" مخدوم نے ۱۹۳۹ء میں لکھی۔ حویلی دیسی ریاست حیدرآباد کے اس زمانے کے ماحول اور سماج کی ترجمانی ہے وہ اس ماحول اور سماج کو ایک ایسی بوسیدہ حویلی سے مثال دیتے ہیں جہاں چاروں طرف "اندھیرا" ہے جس کا ہر حصہ کھنڈر

میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ قاتلوں کی خواب گاہ ہے اور یہاں بے انصافی اور بے ایمانی کا دور دورہ ہے۔ انسانوں کا نیلام ہوتا ہے یہ وہ مقام ہے

زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں

اس نظم میں مخدوم کے احتجاج اور برہمی کی آواز بہت تیز اور ان کا طنز بہت تیکھا ہے۔ وہ اس بوسیدہ حویلی کو جو حیدرآباد ہی میں نہیں ہر جگہ نظر آ سکتی ہے پوری طرح ڈھا دینے کی کوشش میں ہیں۔

آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

قدیم اور فرسودہ معاشرے کو "بوسیدہ حویلی" کہنا جو "نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج" لے رہی ہے شاعرانہ اظہار بیان کی بلندیوں کو ظاہر کرتا ہے ؎

اک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج

اس نظم میں جو طنز ہے اور جو تشبیہات استعمال کی گئی ہیں وہ متاثر کن اور اچھوتی ہیں ؎

ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

●

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

•

زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ

•

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس منزل میں ہے

•

"جہانِ نو" میں مخدوم ایک ایسے جہان کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کا اچھوتا نظام ہو اور جس کے نئے صبح و شام ہوں وہ ایسے عہد نو کے لیے بغاوت اور انقلاب کو ضروری سمجھتے ہیں اور انقلاب کو آواز دیتے ہیں۔

انھوں نے نظم "انقلاب" اس زمانے میں لکھی جب آزادی کی قومی تحریک میں کچھ ڈھیلا پن پیدا ہوگیا تھا اور مایوسی اور بے عملی عام تھی۔ کئی برسوں سے ملک کی آزادی کا انتظار تھا اور یہ توقع تھی کہ ملک جلد آزاد ہوجائے گا لیکن یہ توقع پوری نہیں ہو رہی تھی۔ مخدوم انقلاب کا انتظار اس بے چینی اور کچھ ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب ہی ان کا محبوب ہے

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اس نظم میں شاعر ہی نہیں بلکہ سارا ملک اور تمام لوگ منتظرِ انقلاب کے لیے بے قرار کھڑے ہیں۔ انقلاب کے نہ آنے پر حیات کے انداز و تیور بدلے ہوئے ہیں۔ ہر سو اور ہر سمت اداسی اور مایوسی ہے۔

نہ تابنا کی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

عزیز احمد اس نظم کے بارے میں کہتے ہیں "انقلاب' میرے خیال میں مخدوم کی کامیاب ترین اور سب سے زیادہ موثر نظم ہے اس نظم میں انقلاب اور عشق ایک ہو جاتے ہیں"۔

دوسری جنگ عظیم اور اس کی ہولناکیاں "اندھیرا" کا پس منظر ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے ترقی پسند طاقتوں پر حملہ اور سامراجی تباہ کاری اور جبر و تشدد کو پیش کیا ہے۔ یہ اندھیرا رجعت پسند نظام کا ہے جس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہر چیز مانگی ہوئی ہے ۔

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن

اس اندھیرے کے باوجود اس نظم میں بھرپور اعتماد بھی ملتا ہے
شاعر کو یقین ہے کہ یہ نظام اور دنیا جس کے پاس "اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں" باقی نہیں رہ سکتی۔

رجعت پرست قوتوں کی رات عارضی ہے اور آخر میں شاعر بشارت دیتا ہے سہ

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

مخدوم کی یہ پہلی آزاد نظم ہے۔ پابند شاعری سے آزاد نظم کا رخ کرنے کا رجحان خود اس نظم میں اس طرح ملتا ہے کہ ابتدا میں یہ معریٰ و مقفیٰ انداز میں شروع ہوتی ہے اور پھر آزاد اور معریٰ شکل میں آگے بڑھتی اور ختم ہو جاتی ہے۔ "اندھیرا" لکھنے کے کچھ عرصہ بعد آزاد نظم لکھنا شاعر کا ایک مستقل رجحان بن گیا

"انقلاب" اور "اندھیرا" کا جدید شاعری کی کامیاب انقلابی نظموں میں شمار ہوتا ہے۔ جس میں انقلاب کی گھن گرج کے ساتھ

شعریت کی مٹھاس اور نغمگی بھی ملتی ہے۔ جس کا احساس نظم پڑھتے ہوئے ہر قاری کو ہو جاتا ہے۔

"آزادیٔ وطن" مخدوم کی قومی نظم ہے اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ اس زمانے میں حیدرآباد میں دکنی تحریک یا آزاد حیدرآباد کی تحریک چلائی جا رہی تھی۔ یہ ایک رجعت پسند تحریک تھی جس کا مقصد ملک کی آزادی کی تحریک سے ریاست کے عوام کو الگ تھلگ رکھنا تھا اور اس تحریک کی بنیاد ان خیالات پر رکھی گئی تھی کہ حیدرآباد دکن ایک علٰحدہ اور خود مختار ریاست ہے اور دکن کی تہذیب ایک علٰحدہ اور مکمل تہذیب۔

یہ تحریک دن بدن حیدرآباد میں زور پکڑتی جا رہی تھی۔ یہاں کے بہت سے قائدین، لکھنے والے اور شاعر اس تحریک کے بنیادی خیال کو عام اور مضبوط بنانے میں کوشاں تھے۔ مخدوم نے اسی زمانے میں ہی اپنے خیال کا برملا اظہار کیا کہ حیدرآباد میں شاہی اور جاگیرداری باقی نہیں رہے گی اور حیدرآباد ہندوستان کا حصہ ہوگا اس نظم میں آزادی کے جذبے کا انتہائی بھرپور اور شدید اظہار ملتا ہے ؎

چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشید خاور بن کے نکلی ہیں

وطن سے محبت اور ان کی آزادی کا عزم و ایقان بھی اس

نظم میں انتہائی واضح ہے ؎

بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

"سپاہی" "جنگِ آزادی" اور "بنگال" مخدوم کے اچھے اور کامیاب گیت ہیں جن میں جنگِ آزادی سب سے مشہور اور مقبول ہے۔ اس گیت نے سارے ملک میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور مخدوم کو عوام کا ایک محبوب شاعر بنادیا۔ یہ گیت مخدوم کے سیاسی عقیدے کا ترجمان ہے۔ اس گیت میں انھوں نے ہندوستان کے محکوم عوام، مزدوروں اور کسانوں کے جذبات، احساسات اور تمنّاؤں کو پیش کیا لیکن اس کی بنیاد قوم پرستی نہیں بین الاقوامیت ہے۔ کہتے ہیں ؎

سارا سنسار ہمارا ہے
پورب، پچھم، اُتر، دکن
ہم افرنگی، ہم امریکی
ہم چینی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن
آہن پیکر فولاد بدن

انھیں ایک ایسی دنیا کی خواہش اور تمنّا ہے جس میں سوراج ہو اور مزدور کا راج ہو ؎

لو سرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے
آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے
آزادی کا آزادی کا

اس گیت میں سادہ الفاظ کے ذریعہ شعریت اور ترنگ کے امتزاج سے کچھ عجیب سا سحر اور جولانی پیدا کی گئی ہے۔ سادگی میں یہ کمال ــــ واقعی کمال کی بات ہے

"سپاہی" مخدوم کا ایک کامیاب اور موثر گیت ہے۔ مخدوم اس گیت میں ایک خاص فضا اور کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے بڑے دکھ اور افسردگی کے ساتھ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ساری کائنات جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے دہشت زدہ ہے۔ جنگ کی دہشت اور اس کا خوف ملاحظہ ہو۔

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

اس گیت میں جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے خوف اور دہشت کے تذکرہ کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کے شعور کی پختگی اور فکر کی گہرائی ایسے سپاہی کو بھی دیکھتی ہے جسے صرف جنگ کا ایندھن بنایا جارہا ہے۔ برطانوی نو آبادیاتی طاقت غلام ہندوستان کے نوجوانوں کو اسی مقصد کے تحت جنگ میں استعمال کر رہی تھی۔ مختصر ہونے کے باوجود بڑی موثر اور جامع نظم ہے' جس کا تاثر وقتی یا ہنگامی نہیں۔ عزیز احمد "ترقی پسند ادب" میں اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "سپاہی" میں زیادہ تر ذہنی شاعری کا پیرایہ اظہار ایسے سیدھے سادے الفاظ میں ہے کہ عالم کی طرح ان پڑھ آدمی بھی محسوس کرتا ہے کہ ساری کائنات اس لڑائی کو خوف اور عبرت سے دیکھتی ہے جو غلامی کے لیے لڑی جائے لیکن اس لڑائی سے ہمدردی رکھتی ہے جو مساوات اور آزادی کے لیے ہو۔

"استالین" مخدوم کی ایک کامیاب انقلابی آزاد نظم ہے یہ نظم قازقستان کے ایک تاتاری شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے ولولہ' حرارت اور جوش پیدا ہوتا ہے اور حرکت اور عمل کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ نظم کے یہ مصرعے نہ صرف حرکت و عمل کا پیام دیتے ہیں بلکہ

خود شاعر کی ذہنی کش مکش کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں

کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

کیا مجاہد نہ بنوں ؟

کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

مرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر

شاعر اپنے زمانے کی جدو جہد اور کش مکش میں عملی طور حصہ لینا چاہتا ہے اب وہ صرف شاعری کو ذریعۂ نجات نہیں سمجھتا کیونکہ دور کی کش مکش اور حالات اسے عمل کی دعوت دے رہے ہیں ۔

مخدوم کی یہ نظم انقلابی حقیقت پسندی کی بڑی اچھی مثال ہے ۔ اردو کی انقلابی شاعری میں ہیئت کے اعتبار سے اس نظم کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اس میں ترنم اور غنائیت ہے اور ایک خاص آہنگ اور صوتی کیفیت پائی جاتی ہے ۔

مخدوم نے اپنے ماحول ، اس کی برائیوں اور اسباب کا بہت گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور زندگی کو اس کی ساری وسعتوں کے ساتھ سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ شاہی جاگیرداری

اور سرمایہ داری کو انسانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور محکوموں کے لیے دردمند دل ہے۔ انھیں جو دکھ درد جھیلنے پڑتے ہیں؛ اس سے ان کا دل بھر آتا ہے۔ اسی لیے موجودہ ماحول اور زمانے کے خلاف سخت بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں، وہ ایک ایسی دنیا اور ایسا نظام تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس میں سامراج اور سرمایے کے ظلم و ستم نہ ہوں۔ انسان پر انسان کی بیداد نہ ہو اور ان کی محنت اور عزت کا نیلام نہ ہو۔ اس لیے وہ بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں۔ عوام کی قوتِ عمل کو ابھارتے ہیں۔ وہ ایک ایسے نظام اور دنیا کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں جس میں "سوراج" ہو اور "مزدور" کا راج ہو۔

مخدوم کی انقلابی شاعری خلوص، یقین اور خود اعتمادی سے عبارت ہے۔ انھیں غربت اور غلامی اور سماج کی بے راہ روی اور گندگی سے سخت نفرت ہے اور جب وہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ ان کی چند نظموں میں جو ابتدائی دور کی ہیں، لہجے کا جلال شعریت پر غالب نظر آتا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی شعریت ان کی انقلابی شاعری پر غالب ہے۔ مخدوم کی بعض ابتدائی نظموں مثلاً "باغی" اور "موت کا گیت" میں جوش، ابال، نفرت، غیض و غضب کی فراوانی ہے۔ ان نظموں کے اسلوب اور ان کے طرزِ بیان پر جوش کا اثر نظر آتا ہے لیکن ان کی شاعری کا یہ دور

بہت مختصر رہا۔ اگر مخدوم کی انقلابی نظموں کا مجموعی حیثیت سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں خطیبانہ اور واعظانہ انداز نہیں بلکہ نرمی لطافت کا عنصر نمایاں ہے ۔۔۔ ان کی طبیعت کی ترنگ اور شوخی ان کی شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے جس کی وجہ سے انقلاب کے نعرے لگانے سیاسی پس منظر کو اجاگر کرنے اور ایک نصب العین اور نظام فکر کو مرکز نگاہ بنانے کے باوجود ان کی شاعری سطحی، پھسپھسی اور نعرہ بازی کی شاعری بن کر نہیں رہ گئی ان کے اشعار میں ترنم اور نغمگی کی کیفیت اور وجدانی لطف کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں ۔۔۔

"مخدوم کی شاعری میں غنائیت اور ترنم کے ساتھ جدوجہد کا حوصلہ اور مستقبل پر یقین ملتا ہے۔ مخدوم نے اپنی ہنگامی نظموں میں بھی تلقین محض یا محض نعرہ بازی سے ادبی اسلوب کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیاسی غلامی اور برطانوی استبداد کا دور ختم ہونے پر بھی مخدوم کے اس دور کی نظمیں آج بھی اوراق پارینہ نہیں کی جاسکتیں۔"

مخدوم کے انقلاب کا تصور واضح اور سائنٹی فک ہے۔ وہ اشتراکی انقلاب میں یقین رکھتے ہیں۔ سرمایہ داروں اور استحصال پسندوں کے خلاف وہ نعرۂ بغاوت بلند کرتے ہیں اور انھیں اس بات کا یقین ہے کہ جاگیرداری، شاہی اور سرمایہ داری نظام کے دن ختم ہو گئے ہیں

اور اب ساری دنیا پر عوام کی حکومت ہوگی۔ ان کی انقلابی شاعری میں حال سے بیزاری خوش آئندہ دنوں کی امید، ماحول اور زندگی کو بدل دینے کی خواہش، عزم اور ولولہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے نظریات، خیالات اور جذبات و احساسات کو بڑے شاعرانہ اور فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

☆

ردِ عمل، تجزیہ اور اس کے بعد

مخدوم کی "سرخ سویرا" اور اس کے بعد کی شاعری کے لہجے
مزاج، آہنگ اور موضوعات میں جو فرق پایا جاتا ہے، وہ خود
مخدوم کے الفاظ میں "ایک نیاپن ہے جو عمر، تجربہ اور خود
عہدِ حاضر کی نوعیت کے اپنے ما سبق سے مختلف ہونے کا
نتیجہ ہے"۔ تاریخی اور سماجی تبدیلیوں کے اثرات ادب اور شاعری
پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۴ء سے پہلے کے زمانے اور سماج
کے مقابلے میں ۱۹۵۱ء اور اس کے بعد کے زمانے اور سماج میں
جو فرق پایا جاتا ہے، وہ کوئی معمولی فرق نہیں ہے، اسی دوران
میں ملک بیرونی تسلط سے آزاد ہوا۔ پنجاب، بنگال اور ملک کے

دوسرے حصّوں میں فرقہ وارانہ فسادات سے ساری انسانیت لرز اٹھی۔ آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے ساتھ ہی ساتھ تاریخ کے اس ہولناک المیہ اور بہت سے خوابوں اور تصورات کے چکنا چور ہو جانے کے واقعات اور حادثات ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں اضطراب، ہل چل اور تشکیک کو جنم دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ گریز، مایوسی، فرار اور ندامت کے احساسات بھی اردو ادب میں پیدا ہونے لگے۔ نعرہ بازی کا طوفان تھمنے لگا تو ماتم کا شور بلند ہوا۔ ادبی رجحانات، میلانات اور نقطۂ نظر میں تغیر اور تبدیلیوں کو تاریخ کے تسلسل اور سماجی شعور کے ارتقا کو پیشِ نظر رکھ کر ہی جانچنا چاہیئے۔

عملی سیاست سے مخدوم کی سرگرم وابستگی کی وجہ سے اگر ان کی شاعری کے لب ولہجے اور موضوعات کی تبدیلی کو سیاسی زندگی میں ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے جوڑ کر دیکھا جائے تو یہ ایک شاعر کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ مخدوم نے زندگی کا مطالعہ ہمیشہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے ایک سیاس کی حیثیت سے نہیں۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۱ء تک انھوں نے سوائے "تلنگانہ" کے کوئی اور نظم نہیں لکھی۔ مخدوم اس سات سال کے عرصہ میں بدلتے ہوئے حالات اور تبدیلیوں سے قریب ہی نہیں رہے انھوں نے سیاسی تحریکات میں راست عملی حصہ لیا۔ یہی نہیں

بلکہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے رہنماؤں میں بھی وہ شامل رہے۔ اُن کے ہم عصر شعراء میں کوئی اور اس دور کی کش مکش اور ہنگاموں سے اتنا قریب نہیں رہا۔ اس کے باوجود ان کی کوئی نظم اپنی "خارجی" شکل میں ان کے ذہن کے دریچوں سے باہر نہیں آسکی۔ سات سال کی اس خاموشی کو محض خاموشی تصور کرنا ایک غیر شاعرانہ JUDGEMENT ہوگا۔ شاعری کی "داخلی تخلیق" اور اس کی "خارجی شکل" کے درمیان بعض اوقات برسوں کی دوری اور فاصلہ ہوا کرتا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد مخدوم کا متواتر اور مسلسل شعر کہنے کا موڈ، روانی اور موزونیِ طبع —— کیا ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ غیر شعوری طور پر سہی لیکن تجزیہ اور محاسبہ کے بعد ہی ان کی شاعری الفاظ، بحور، اور قافیہ اور ردیف کے خارجی لباس میں جلوہ گر ہورہی ہے۔ اگر شاعر کسی ہنگامی یا وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر فوری اپنے جذبے کے اشتعال اور فکر کے ہیجان کو نظم کر کے شائع کردے تو اس کی شاعری میں سطحیت، پھسپھساپن اور نعرہ بازی داخل ہو جاتی ہے۔ اپنی سیاسی اور عملی زندگی میں دن رات "نعروں" اور ہنگاموں سے راست تعلق کے باوجود مخدوم کا نعرہ بازی اور سطحی موضوعاتی شاعری سے گریز ایک شاعرانہ گریز اور ایک صحت مند علامت ہے۔ ہم کسی شاعر سے یہ مطالبہ بھی تو نہیں کرسکتے کہ وہ خاص خاص موقعوں اور خاص خاص لمحوں میں "یہ" لکھے اور "وہ" لکھے۔

مخدوم نے اپنے دوسرے مجموعہ "گلِ تر" کے پیش لفظ میں "پڑھنے والوں سے" کے زیرِ عنوان جو چند سطور لکھی ہیں انھیں سب سے زیادہ بھروسہ کے قابل شہادت تصور کرنا چاہیئے۔ مخدوم کا اپنے بارے میں یہ بیان خاص طور سے اہمیت کا حامل ہے۔

"شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اُجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فردِ معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے، پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالمِ خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہمکلام ہو۔" [1]

"سرخ سویرا" سے "گلِ تر" تک کے سفر میں مخدوم کا سماجی اور جمالیاتی شعور بھی پختہ ہوتا گیا ہے۔ ان کے مزاج کا ٹھہراؤ، ربط، اعتدال پسندی، عقلیت کی کسوٹی پر ہر جذبے اور ہر تاثر کو پرکھنا اور "انتظار کشی" کا کچھ اندازہ "سرخ سویرا" کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں بھی ہوتا تھا "گلِ تر" اور اس کے بعد کی بعض نظموں اور بیشتر غزلوں میں یہ خصوصیات زیادہ واضح اور مکمل روپ میں ملتی ہیں

---

[1] "گلِ تر" کے پیش لفظ بعنوان "پڑھنے والوں سے" ص ۵ اور ۶

مخدوم کے پہلے اور دوسرے دور کی شاعری میں "استالین" کو ایک کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے سچے خلوص اور جذبے کی پوری شدت کے ساتھ "کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں" "کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں" "کیا مجاہد نہ بنوں؟" جیسی باتیں کہی تھیں کیونکہ وہ تاریخ کے اس مرحلے پر اپنے آپ کو "اس رزم کا خاموش تماشائی" دیکھنا نہیں چاہتے تھے "جنت کو جہنم کے حوالے" کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے تلوار اٹھائی اور تلنگانہ کی ہتھیار بند جدوجہد سے وابستہ ہو گئے۔ اشتراکی انقلاب ان کی منزل اور عوام ان کے محبوب تھے۔ اس دور میں وہ انقلاب کے گیت گا سکتے تھے۔ مزدوروں اور کسانوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے والے ترانے لکھ سکتے تھے لیکن سیاسی اور سماجی زندگی کے تجربے کو انھوں نے شعری تجربہ نہیں بنایا۔ سیاسی و انقلابی رہنما کی خارجی دنیا کو انھوں نے شاعر کی داخلی دنیا سے الگ ہی رکھا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۱ء تک کی مدت میں انھوں نے جو ایک نظم "تلنگانہ" لکھی ہے وہ بھی شاید اس خیال سے کہ "دیر تلنگانہ" کا تلنگانہ پر کچھ نہ لکھنا بڑی عجیب بات سمجھا جائے گا۔ اس دور میں تو ان کے بعض ہم عصر شعرا اور ادیب تلنگانہ اور اس کے ہنگاموں سے دور رہنے کے باوجود بھی تلنگانہ کو موضوع بنا رہے تھے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں مخدوم گرفتار ہوئے۔ جیل میں

گزارے ہوئے دن بالعموم ارباب فکرو دانش کو گزرے ہوئے ایام کی ہر بات زندگی کے ہر حادثے، تجربے اور تاثر کا گہرا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جیل کی تنہائی میں یادوں کا ہجوم شعری تاثرات کی باز تعمیر کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ چنانچہ مخدوم نے اپنے سات سالہ سکوت کو جیل کی چار دیواری میں ہی "قید" لکھ کر توڑا۔ "شاہراہوں میں"، گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ" انھیں یاد آئی" ان کے مصروف" قدموں کی آواز انھوں نے سنی۔ اپنے محبوب کی طرح انھوں نے عوام کو یاد کیا لیکن زنداں کی گھٹن اور مایوسی کے احساس سے وہ دور رہے۔ انھیں غم تھا تو صرف یہ کہ ان کا گنجِ گراں مایۂ عمر ــــ نذرِ زنداں ہوا ــــ نذرِ آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا۔" اس لہجہ اور اس رویّہ نے اس مختصر نظم میں بڑا تاثر اور انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ جیل کی زندگی مختصر ہونے کی وجہ سے وہ قید کے علاوہ اور کوئی نظم نہیں لکھ سکے۔ اس کے بعد وہ سیاسی زندگی اور الیکشن کے ہنگاموں میں شب و روز مصروف ہو گئے۔ دماغ کے دریچے جو جیل میں کھل گئے تھے پھر کچھ عرصے کے لیے بند ہو گئے۔ جیل سے رہائی کے بعد "چارہ گر" لکھنے تک پانچ سال کی مدت میں انھوں نے دو شعر زیرِ عنوان "نیا چین" (۱۹۵۱ء) اور "ماسکو" قریب قریب اتنی ہی مختصر نظم ۱۹۵۳ء میں لکھی۔ "گل تر" میں یہ دونوں غیر اہم نظمیں محض اس وجہ سے شامل ہیں کہ وہ ایک مشہور

اور ہر دلعزیز شاعر کے تبرک کے طور پر شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ان کی نظم "چارہ گر" سے ہوتا ہے۔ تقریباً (۱۲) سال تک تاثرات اور تجربات کے "روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں" تپنے کے بعد ان کی شاعری "داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آئی تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو" لیکن "عالم خارج" میں آنے کے بعد اس پر "داخلیت" کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

"چارہ گر" انھوں نے اپنے سماجی شعور کی پختگی کی اس منزل پر پہنچ کر لکھی ہے، جہاں وہ اپنے ذہنی ارتقا سے مطمئن ہو کر زندگی اور کائنات کے متعلق اپنے شعور کی گہرائیوں سے خیالات کے موتی چُن چُن کر باہر لا سکتے ہیں۔ اس نظم کا موضوع نیا نہیں۔ وہی ازلی ابدی و انغمۂ محبت ہے جو ہر دور میں ہر نظام میں ہر معاشرے میں موجود رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا اور کسی "چارہ گر" کی "زنبیل" میں کوئی "نسخۂ کیمیا" ایسا نہیں جو اس درد کا مداوا بن سکے۔ غالب نے بھی یہی بات

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کہی تھی۔ مخدوم نئی اور قدیم اقدار، ان کی کش مکش نئے بدلتے ہوئے سماج، نئی دنیا اور نئے معاشرے غرض سب کچھ دیکھنے اور دید و دیدم

کی سیر مکمل کرنے کے بعد یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ دو بدن پیار کی آگ میں جلتے ہیں۔ اس گتھی کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ خواہ جاگیر شاہی ہو یا مذہبی نظام ہو یا آج کا غیر مذہبی سیکولر نظام حیات۔ مندروں کے کواڑ، مسجدوں کے مینار اور مے کدے کے در، اُن ہی مختلف نظام ہائے حیات کے SYMBOLS ہیں۔

'چارہ گر' اور اس کے بعد کی شاعری میں ان کا یہ احساس اور تاثر بار بار ہمارے سامنے آتا رہا ہے کہ فرد اور غمِ ذات کے مسائل کسی میکانکی اصول، ضابطہ یا قانون کے ذریعے ختم نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ انسانی ذہن اور نفسیات سے متعلق یہ نازک مسائل جن میں محبت یقیناً سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ گتھی ہے کش مکش حیات کے لیے ازل سے ابد تک ہمیشہ برقرار رہیں گے۔ ہاں انھیں یہ احساس ضرور ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں سماجی و معاشی مساوات کا دور دورہ ہو، انسانوں کے لیے بہتر اور پر مسرت زندگی کے زیادہ مواقع فراہم ہو گئے ہیں کیوں کہ طبقاتی کش مکش اور استحصال کے ختم ہو جانے کی وجہ سے فرد پہلے کے مقابلے میں زیادہ آزاد ہے۔ اس کے باوجود نئے جبر ہو سکتے ہیں کش مکش کی نوعیت اور شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ یورپ اور مغرب کی نئی صنعتی سوسائٹی میں یہ نئی کش مکش اور تضادات کی اس بدلی ہوئی نوعیت نے شاعری اور فنون لطیفہ پر

گہرے اثرات ڈالے ہیں اور اس کے زیر اثر ہی شاعری اور فنون لطیفہ میں مختلف نئے رجحانات اور مسائل شامل ہوئے ہیں۔ قدیم اقدار اور اصطلاحوں کے معنی اور مفہوم میں بھی بہت فرق آچکا ہے۔

"آج کی رات نہ جا" میں زندگی کی جانب مخدوم کا رویہ صحتمند اور مثبت نوعیت کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی لطف بھی ہے اور آزار بھی، سازو آہنگ بھی اور زنجیر کی جھنکار بھی ــــ تکمیل تمنا بھی اور حسرت بھی، زہر بھی اور آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ــــ بہرحال زندگی زندہ رہنے اور مسکرانے کے لیے ہے اور وہ" ایک رات" بھی کتنی یادگار اور کس درجہ حسین رات ہوگی جو "بہت راتوں کے بعد" آئے اور جس میں کوئی "محبت کی نظر" شاعر کے لیے ہی "وقف" ہو۔ اس نظم، مختلف غزلوں کے کئی اشعار اور بعض دوسری نظموں میں بھی مخدوم نے یہ رومانی فضا پیش کی ہے۔ دراصل انھوں نے اپنی زندگی کے بعض حقیقی تجربوں کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ غزل اور "جانِ غزل" کی جانب ان کا یہ رجحان "سرخ سویرا" اور "گلِ تر" کی شاعری کے ایک نمایاں فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

"چاند تاروں کا بن" ہندوستان کی پچھلی تیس سالہ تاریخ، جدوجہد آزادی اور حصول آزادی کے بعد کے ہنگاموں اور المیہ کو پیش کرتی ہے۔ یہ نظم مخدوم کی سیاسی اور عوامی زندگی کے تاثرات اور تجربوں کا نچوڑ بھی ہے لیکن یہ تاثرات ایک سیاست داں کے

نہیں ہیں، ایک شاعر کے ہیں۔ انھوں نے ہر واقعہ، ہر موڑ اور ہر بات کا ایک حساس شاعر کی حیثیت سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں بڑی روانی، بڑا تاثر اور موسیقیت ملتی ہے۔ موضوع کی وسعت کے باوجود انھوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ شاعر نے چُن چُن کر استعمال کیا ہے اور اپنے مجموعی تاثر کو عمیق مطالعہ اور گہری سوچ کے بعد ہی نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔ "چاند تاروں کا بن" لکھنے تک مخدوم یہ دیکھ چکے تھے کہ آزادی کے متوالے کس طرح "موم کی طرح" جلتے پگھلتے رہے تاکہ نیا سویرا طلوع ہو اندھیرا چھٹے اور روشنی آئے۔ آزادی کے دیوانوں نے ہر مصیبت جھیلی، سختیاں برداشت کیں، بے غرضی کے ساتھ ایثار کیے حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی قربان کردیں ــــ انھیں تشنگی ضرور تھی مگر وہ اُس تشنگی میں بھی سرشار تھے" ــــ لیکن صبح دم ــــ وہ ایک " دیوارِ غم" بن گئے۔ کیوں کہ "رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو" ــــ "جوئے خوں بن گیا" ــــ مخدوم کا اشارہ ان قیامت خیز فسادات کی طرف ہے جو حصولِ آزادی کے مرحلے پر اور حصولِ آزادی کے بعد دیکھے گئے "رات" نے جاتے جاتے خون کی ندیاں بہادیں۔ اس نظم میں موم کی طرح جلتے ہوئے شہیدوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اُن "امامانِ صد مکروفن" کی طرف بھی اشارہ ہے جو ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ہی

نہیں بلکہ ہر جگہ ہر جدو جہد آزادی کی تاریخ میں نظر آتے ہیں جو "خونِ
نورِ سحر" پی جاتے ہیں اور سادہ لوح بے غرض انسانوں کو رہزن کے
بھیس میں رہنما بن کر ڈس لیتے ہیں۔ مخدوم کا یہ کہنا کہ

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا اُجالا بھی ہے

یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُجالا ضرور ہوا ہے لیکن "کچھ کچھ اُجالا" ہے
کیوں کہ اس کے ساتھ وہ اندھیرے کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ اندھیرا
ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ رات کی ان تلچھٹوں اور اندھیرے کو مخدوم
نے ذیلی براعظم ہندوستان میں آزادی کے بعد دیکھا ہے اور روس
میں طلوع اشتراکیت کے بعد بھی انہیں یہ اندھیرا نظر آیا ہے
یہ اندھیرا ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیسیوں ممالک میں
جدوجہد آزادی کی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد بھی دیکھا گیا، اور
دیکھا جا رہا ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

اب منزلِ مقصود صرف ایک منزل نہیں بلکہ پیار کی اور کوئے دلدار کی منزلیں ہیں۔ شاعر کا شعوری ارتقا اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اب اسے یہ جستجو اٹل معلوم ہوتی ہے کہ راہوں کے بعد منزل آتی ہے اور منزل کے بعد پھر راہیں شروع ہو جاتی ہے۔ منزلِ مقصود تو صرف ایک خیال اور تصور ہے۔ زندگی کو زیادہ حسین زیادہ خوب صورت اور اس دھرتی کو انسانوں کے لیے زیادہ اچھی رہنے کی جگہ بنانے کے لیے جدوجہد ہمیشہ جاری رہے گی کیوں کہ کشمکشِ حیات کے ہنگامے ختم نہیں ہو سکتے۔ کوئی سویرا مکمل سویرا نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ کہیں سویرا ہو جانے کے بعد بھی گھٹا ٹوپ اندھیرے کے چھا جانے کا احساس رہتا ہے اور کہیں سویرا تو ہو جاتا ہے لیکن کچھ کچھ اندھیرا باقی رہتا ہے۔ اس اندھیرے کے فرقِ بیش و کم کا انحصار مخصوص تاریخی حالات، نوعیتِ انقلاب اور جدوجہد کے فرق پر ہوتا ہے۔

مخدوم کی یہ نظم بڑی جامع اور ان کے دوسرے دور کی شاعری کی بہترین نظم ہے۔ اس موضوع پر اردو میں جتنی نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں یقیناً اس نظم کو ایک خاص مقام حاصل رہے گا۔ اس نظم میں بڑی آفاقیت ہے۔ شاعرانہ اظہار کی صداقت اور بھرپور تاثر کی یہ نظم بڑی عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں خوابوں کی تعبیر کے

چہرے مسخ شدہ نظر آتے ہیں جن سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں آرزوؤں اور تمناؤں میں تصادم نظر آتا ہے۔ اس نظم کا غم سب کا غم اور درحقیقت تاریخ کا غم ہے۔ یہ غم اور یہ المیہ کسی خاص دور اور خاص ملک سے ہی وابستہ نہیں بلکہ ہر دور اور ہر ملک سے اس کا تعلق ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے اس نظم میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر، مایوسیوں، تمناؤں کے خون اور خوابوں کی خوفناک تعبیروں کو تو بیان کرتا ہے لیکن وہ ناامید نہیں بلکہ پھر ایک سچے شہید کے جذبے کے ساتھ دوش پر صلیب اٹھائے اگلی منزلوں کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسے ہی شہیدوں نے انسانی تہذیب کو ارتقا کی منزلیں طے کرائی ہیں یہ شہید زہر کے جام پیتے رہے اور صلیب و دار کا خیر مقدم کرتے رہے ہیں تاکہ آگے کی منزلوں کی طرف سفر حیات جاری رہے اور حسین سے حسین تر کی تلاش کبھی ختم نہ ہو۔

"رقص" مخدوم کی ایک اہم حسیاتی نظم ہے جس کا تیسرا بند عروضی، حسیاتی، موضوعی ہر اعتبار سے نظم کا نقطۂ عروج ہے جس میں نظم کی مجموعی غنائیت بھی بلند آہنگ ہو جاتی ہے۔

بدن مہک مہک کے چل
کمر لچک لچک کے چل

قدم بہک بہک کے چل

رقص دراصل زندگی کا رقص ہے جسے شاعر چمن کی ہری ہری روش پر دیکھتا ہے جہاں "چاندنی کی نرم نرم آنچ میں پتی ہوی" اور "سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوی جوانیاں" اسے ہم قدم اور ہم کلام نظر آتی ہیں شاعر کی تمنا ہے کہ حسن وعشق کے کے ہم قدم و ہم کلام ہوتے ہیں سرمایہ دارانہ سماج میں اونچ نیچ، طبقات اور قیود و رسوم وغیرہ کے عنوان سے جو رکاوٹیں پائی جاتی ہیں وہ دور ہوں بساطِ رقص اور بسیط ہو صدائے تیشہ کامراں ہو اور کوہ کن کی جیت ہو۔ مخدوم اس طرح فطری جذبات کی فطری طور پر آسودگی کی وکالت کرتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ زندگی کے اُن لمحوں میں جو جھومنے، گانے اور مسرور ہونے کے ہوتے ہیں مصنوعی اندیشے، ڈر، خوف اور پابندیاں حائل ہوں۔

سناٹا مخدوم کی مختصر لیکن بڑی پُر اثر نظم ہے۔ اس خوبصورت نظم کی شعریت اور روانی دل میں اتر جاتی ہے۔ شاعر اپنے گرد وپیش کے ماحول میں کوئی "ہلچل" کوئی "دھڑکن" محسوس نہیں کرتا۔ لوگ اُسے بڑے کاروباری نظر آتے ہیں۔ شاعر زندگی میں اضطراب، تڑپ اور سچا جذبہ اور نصب العین چاہتا ہے۔ شاعر اپنے ماحول سے اُداس ضرور ہے لیکن نظم اس خواہش پر ختم ہوتی ہے کہ ؎

کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

رخسار کی مجلی زندگی کے خوب صورت تصور اور آدرش کی تمنا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ شاعر اس سنسان رہ گزر کو جل کر بھسم ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہو۔ یہ نظم مخدوم کے بدلے ہوئے مزاج کے مطابق ہے جس میں وہ اپنے تاثرات اور اپنے ردعمل کا راست اظہار کر دیتے ہیں لیکن مریضانہ یاسیت سے پھر بھی وہ اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

"احساس کی رات" میں جو "سناٹا" سے پہلے لکھی گئی ہے شاعر کا یہی تاثر پایا جاتا ہے جس ماحول کے سناٹے کو انھوں نے اپنی نظم "سناٹا" میں بیان کیا ہے۔ وہ اس ماحول کو احساس کی رات سمجھتے ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ یہ رات بھی سرد نہ ہو جائے کیونکہ سارا ماحول طوفانِ حوادث کے نرغے میں ہے۔ ہوس کی یلغار ہے انھیں یہ اندیشہ ہے کہ بیانِ وفا اور نقشِ وفا کہیں مٹ نہ جائے۔

یہ نظم بھی اس خواہش اور تمنا پر ختم ہوتی ہے کہ

میرے دل اور دھڑک
شاخِ گل
اور مہک اور مہک اور مہک

"گلِ تر" کی بعض نظموں "نیا چین" "ماسکو" اور "گگارن" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ نظمیں رسمی طور پر رواروی میں کہی ہیں۔ ان نظموں میں نہ تو کوئی خاص بات ہے اور نہ شاعرانہ

انداز بیان ہے۔ شاعر اپنے بھرپور تاثر کو پیش کرنے میں ناکام نظر آتا ہے حالانکہ شاعر کے نزدیک ان واقعات کی غیر معمولی اہمیت مسلمہ ہے اس کے برخلاف لومبا کے وحشیانہ قتل پر لکھی گئی نظم "چپ نہ رہو" اسی قبیل کی ایک اور نظم "نہرو" کی طرح کامیاب نظم ہے۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک موضوعاتی نظم ہونے کے باوجود شدت جذبات اور شدت اظہار کو ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ موضوع سے متعلق واقعات کا تسلسل بھی اس نظم میں ان واقعات کے رد عمل اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات کے تسلسل کی شکل میں موجود ہے انسانیت کی تاریخ کے چند اوراق کو اس طرح شعر و جذبات کی زبان میں ظاہر کرنا سیاسی نظم لکھنے کا ایک کامیاب تجربہ ہی نہیں بلکہ صحیح معنی میں مورخ کا رول ادا کرتا ہے۔

☆

مخدوم کا نظم سے غزل کی جانب سفر بدلے ہوئے تاریخی اور سماجی حالات اور خود شاعر کے مزاج کی تبدیلی کا ایک ناگزیر نتیجہ نظر آتا ہے۔ مخدوم نے جو تقریباً ربع صدی تک صرف نظمیں لکھتے رہے تھے ۱۹۵۹ء میں صنف غزل کی طرف توجہ کی اور مختصر عرصے ہی میں کئی غزلیں لکھ کر غزل کی شاعری میں بھی اپنے لہجے

اور اپنی آواز کو شامل کر دیا۔ مخدوم نے غزل گوئی اس وقت شروع کی جب غزل کی بے جا مخالفت ماضی کی بات بن چکی تھی اور بعض ممتاز ترقی پسند شعرا بھی نئی غزل میں نئے مزاج اور نئے آہنگ کے ساتھ اس صنف سخن کی اہمیت و افادیت کو واضح کر چکے تھے آزادی کے بعد کے حالات اور واقعات نے اس صنف کے لیے دراصل سازگار فضا پیدا کر دی تھی۔ آزادی کے ساتھ تاریخ کے انتہائی بھیانک اور انتہائی المناک فسادات، آزادی کے بعد" داغ داغ اُجالا" اور" شب گزیدہ سحر" کا احساس شاعری میں انقلاب کی گھن گرج نہیں بلکہ محرومی اور بدقسمتی کے پُر اثر بیان کا متقاضی تھا۔ محرومی اور بدقسمتی کے اظہار کے معنی احساس ندامت اور گریز و فرار ہرگز نہیں ہوتے اگر بعض شعراء نے اقدار کو تبدیل ہوتے دیکھ کر فرار یا گریز کا راستہ اختیار کیا اور محض داخلیت کے خول میں بند ہو گئے تو یہ کوئی صحت مند علامت نہیں تھی۔ آزادی کے بعد کے درد اور غم کو اپنی ذات میں رچا کر بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ فیض نے اس سلسلے میں کامیاب تجربے کیے۔

مخدوم نے جب غزل گوئی شروع کی تو فراق، فیض، جذبی اور مجروح کی غزل گوئی کے کامیاب نمونے ان کے سامنے موجود تھے کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں تھی۔ مخدوم نے اپنی غزلوں میں اپنے اظہار پر ہی توجہ کی۔ ایک نظام فکر سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ "سرخ سویرا" تک اپنی نظموں میں ابہام سے احتراز کرتے

رہے تھے لیکن گُلِ تر سے ان کی نظموں میں اشاریت کا عنصر نمایاں ہونے لگا لیکن طویل عرصے کی خاموشی کے بعد صرف چند نظمیں لکھ کر وہ مطمئن نہیں ہو سکے۔ دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ برس ہا برس کے تجربات اور تاثرات اظہار کا فارم اور راستہ چاہتے تھے۔ اچھا شاعر فارم کو منتخب کر کے اپنی شاعری کو خارجی شکل نہیں دیتا بلکہ اس کے ذہن کے اندر شعر مطلق کی تخلیق موزوں فارم کو عملِ تخلیق کا ایک جز بنا کر ہی منتخب کر لیتی ہے۔ مخدوم کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک اچھے شاعر کی طرح از خود غزل کے فارم کا انتخاب کیا۔ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہونے کے باوجود مخدوم نے غزل کے فارم کو بڑے سلیقے اور احتیاط سے برتا ہے۔ ان کی غزل میں اُردو کی روایتی غزل کا لہجہ اور آہنگ ملتا ہے۔ روایتی غزل کی داخلیت بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ مخدوم نے بلاشبہ غزل کے فن کا پورا اہتمام کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی غزل محض روایتی غزل نہیں۔ اس کی فضا، عام غزل کی فضا سے مختلف ہے۔ مخدوم کی نظم میں اسلوب کا جو اچھوتا پن، زبان و لفظیات کی جو تازگی اور فکر کی جو ندرت ملتی ہے قریب قریب وہی خصوصیات ان کی غزل میں بھی موجود ہیں۔ غزل میں انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اگرچہ روایتی غزل ہی سے اخذ کی گئی ہے لیکن فکر و اسلوب کی تازگی اسے روایتی غزل کی فضا سے دور لے جاتی ہے۔

اُن کی نظموں میں نئے الفاظ کا استعمال اور انداز بیان چونکا دینے والا ہوتا ہے لیکن غزل میں انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ غزل کے فن، زبان اور اسلوب تینوں پر انھوں نے توجہ دی ہے۔ اگر نظم نگار شاعر غزل کہتا ہے تو اس کی غزل پر خارجیت غالب ہو جاتی ہے اور داخلیت، گھلاوٹ اور لطافت کی کمی رہتی ہے لیکن مخدوم کی غزل میں یہ بات نہیں ہے۔ مخدوم کی شبابیاتی شاعری میں ایک قسم کی لہک تھی لیکن ان کی غزل میں گداز بھی ملتا ہے۔ وہ غزل میں سیاسی افکار و مسائل کو بیان کرنے کے لیے پرانی علامتیں استعمال کرتے ہیں اور بڑے سلیقے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

غزل کی صنف کے تقاضوں کا انھوں نے لحاظ رکھا اور ان پر زیادہ توجہ دی ہے۔ سیاسی و انقلابی افکار اور مسائل کو بیان کرنے کی دانستہ کوشش ان کی غزلوں میں نظر نہیں آتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسائل اور تجربات شاعر کی شخصیت میں رچ کر آئے ہیں۔ غزل میں اگر راست افکار آتے ہیں تو اُکھڑا اُکھڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اور غزل کا آہنگ بگڑ جاتا ہے۔ مخدوم کی غزل میں کہیں بھی اُکھڑا اُکھڑا پن نظر نہیں آتا۔ سماجی اور سیاسی مسائل کی ترجمانی غزل کے مخصوص اشاروں اور کنایوں میں ہی ہوئی ہے۔ نئے مسائل کو غزل کی زبان میں بیان کرنے میں انھیں بڑی مہارت ہے۔

سب وسوسے ہیں گرد رہ کارواں کے ساتھ
آ گے ہے مشعلوں کا دھواں دیکھتے چلیں

•

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخر شب

•

دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

•

مخدوم نے اپنے گرد وپیش کے حالات اور مسائل کو اپنے کئی اشعار میں بڑے خلوص اور شدتِ تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے ماحول کی بے حسی، زندگی میں حرکت وعمل کی کمی اور جذبۂ ایثار و قربانی کے فقدان کو انھوں نے اپنے خوب صورت پیرایۂ اظہار میں بیان کیا ہے ؎

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

•

نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

•

گُل ہے قندیلِ حرم گُل ہیں کلیسا کے چراغ
سُوئے پیمانہ بڑھے دستِ دُعا آخرِ شب

•

ان اشعار میں شاعر کا غم یہ ہے کہ زندگی کی حرارت تو ختم ہو ہی چکی ہے۔ "آہ کی آواز" یعنی صدائے احتجاج تک بلند نہیں ہوتی اور نہ ہی "زنجیر کا شور" یعنی بغاوت کے لیے جنبش ہوتی ہے۔ سارا ماحول احساس شکست و ہزیمت کے بوجھ تلے چُپ سادھے ہوئے ہے۔ آہ کی آواز تو درکجا وہ اضطراب کے عالم میں کروٹ بدلتا ہوا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ دیکھتے ہیں کہ بے یقینی ہے۔ عقیدے کمزور ہو چکے ہیں۔ روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ ہیجان اور انتشار ہے۔

جہاں انھوں نے سیاسی اور سماجی زندگی کے نئے مسائل اور نئے تجربات بیان کیے ہیں وہیں انھوں نے حسن وعشق کے تجربات کے اچھوتے پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگر انھوں نے کہیں عام اور پرانے عشقیہ تجربات بیان کیے ہیں تو ان تجربات کو بھی ندرتِ احساس کے ساتھ اور نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان اشعار میں غزل کا گھسا پٹا اسلوب نہیں ملتا۔ اسلوب کی تازگی نے ان میں نئی بات پیدا کر دی ہے ۔

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

•

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

•

جب برستی ہے تری یاد کی رنگیں پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ مے کدہ وا ہوتا ہے

•

وا ہو رہی ہے مے کدۂ نیم شب کی آنکھ
انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں

وہ غزل میں جو ردیف استعمال کرتے ہیں وہ بولتی ہوی ہوتی ہے۔ مثلاً آخر شب، دیکھتے چلیں، کچھ رات کٹے وغیرہ۔ اچھی اور بولتی ہوی ردیف کے استعمال سے غزل کے آہنگ و نغمہ میں اضافہ اور غزل کی معنویت میں قوت اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کی شاعری میں مخدوم کو ایک نظامِ فکر سے وابستگی کے باوجود تحریف پسندی سے کام لینے کا موقع ہاتھ آیا۔ اچھے آرٹ کے لیے ضروری نہیں کہ ہر بات صاف صاف اور واضح طور پر بیان کر دی جائے۔ اشاروں کنایوں میں بیان کی

گئی ادھوری بات زیادہ فن کارانہ حسن اور گہرائی رکھتی ہے۔ مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" اس فن کارانہ کمال کی ایک مثال ہے ان کی غزلوں میں بھی کئی شعر ایسے ملتے ہیں جن میں یہ حسن اور یہ کمال ملتا ہے۔ ان اشعار میں اظہار کی جھجک اور تامل بھی موجود ہے۔ سوال ہیں تشکیک ہے۔ غرض یہ کہ تاثر کے اظہار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اُن کی غزلوں کے کچھ اور خوب صورت کامیاب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اس شہر میں اک آہوے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

•

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

•

اس اندھیرے میں اُجالوں کا گماں تک بھی نہ تھا
شعلہ رو، شعلہ نوا، شعلہ نظر سے پہلے

•

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

●

یہ کوہ کیا ہے یہ دشت الم فزا کیا ہے
جو اک تری نگہہ دل نواز سا تھو رہے

●

شمیم پیرہنِ یار کیا نثار کریں
تجھی کو دل سے لگالیں تجھی کو پیار کریں

●

اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں

●

تحفہ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

●

ہجوم بادہ و گل میں، ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

●

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اُٹھا ہوں، آنکھوں میں اک خواب ناتمام لیے

●

●

سازِ آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ

●

چاند اترا کہ اُتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

●

دل میں اتر کے سیرِ دلِ رہرواں کریں
آہوں میں ڈھل کے ضبطِ فغاں دیکھتے چلیں

●

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

●

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

●

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدو تیشہ کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

●

دھڑک گئے ہیں کبھی دل، کبھی جھکی ہے نظر
کہاں چھپا ہے کسی سے کسی کی چاہ کا رنگ

●

مخدوم نے اگرچہ بہت کم غزلیں لکھی ہیں لیکن ان کا یہ سرمایہ قلیل ہونے کے باوجود بیش قیمت ہے۔ جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اگر وہ اس صنفِ سخن پر بہ دستور توجہ دیتے رہیں تو غزل کی شاعری اور اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کر سکتے ہیں اس وقت بھی وہ بحیثیت غزل گو شاعر اپنے کسی ہم عصر شاعر سے پیچھے نہیں بلکہ غزل کے بنیادی مزاج اور آہنگ کا خیال رکھنے اور روایت کی پابندی اور روایت کو آگے بڑھانے کے معاملے میں وہ فیض سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ غزل کہنے کا اہتمام، سلیقہ، فکر کی سنجیدگی اور شعریت کے ساتھ اس کا خوب صورت امتزاج یہ اہم اور بنیادی خصوصیات ان کی غزل میں صاف دکھائی دیتی ہیں جب کہ اس میدان میں فیض کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو موضوعِ بحث اور ہدفِ تنقید بنایا جا سکتا ہے۔

مخدوم کی ابتدائی دور کی شاعری میں بڑی معصومانہ رومانی

فضا پائی جاتی تھی۔ لڑکپن کے معصوم تجربوں اور یادوں کو انھوں نے نظم کیا ہے یہ فضا ایسی تھی کہ وہ کہتے ہیں ع

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

لیکن دوسرے دور کی شاعری میں لڑکپن کی یادیں نہیں۔ سنجیدگی ہے۔ ان کا موضوع ان کا اپنا عشق نہیں ــــ بلکہ عشق کا ازلی وابدی تجربہ ہے۔ اپنے تجربے اور تاثر کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ ان کا اپنا نہیں انسانی فرد کا تجربہ اور تاثر ہے۔ مخدوم کی شاعری میں یہ بات یہ سنجیدگی اور فکر کی یہ گہرائی شاعر کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ بھی ہے اس تبدیلی کے نتیجہ میں ان کے اشعار میں گداز اور مزاج میں جنون پسندی کا عنصر بھی نمایاں ہوگیا ہے۔ انھیں اہلِ ہوس سے شکوہ ہے۔ ماحول کی سرد مہری کے وہ شاکی ہیں۔ اس یاس و مایوسی اور اذیت ناک خموشی میں وہ احساسِ جمال اور سچے پیار کے جذبے کو سہارا سمجھتے ہیں، جو ہر دور، ہر صورت، اور ہر ماحول میں باقی رہنے والی چیز ہے۔ ان کی آرزو ہے کہ ـــ

دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں

پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے

"کوہِ غم کتنا ہی گراں اور گراں اور گراں" سہی۔ شاعر کا جنون یہی کہتا ہے "عزم دو تیشے کو چمکاؤ" کیونکہ اس صورت میں

میں کچھ رات کٹ سکتی ہے۔ "تیشہ کی چمک" زندہ احساس اور عزم عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ کچھ رات کا کٹ جانا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ زندگی ہر حال میں زندہ رہنے اور سرگرمیٔ حیات کو جاری رکھنے کے لیے ہے خواہ زندگی کوہ غم کیوں نہ محسوس ہو۔ سرگرمیٔ حیات کا تیشہ اس کوہ غم کی "گرانی" کو کچھ تو کم کرسکتا ہے اور کچھ تو رات کٹ سکتی ہے۔

اس غزل کا ایک عمدہ شعر ہے ؎

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ جن کا احساس مردہ نہیں ہوا ہے یہ کیوں دیکھیں کہ کوئی اور جلتا اور پگھلتا نہیں۔ وہ خود (احساس رکھنے والے) کیوں نہ موم بن جائیں اور پگھل جائیں۔

احساس کی دولت سے مالامال یہ وہی لوگ ہیں جو نظم "چاند تاروں کا بن" میں موم کی طرح جلتے رہے۔ جنھوں نے اعلیٰ تصورات اور آدرشوں کے لیے مصائب جھیلے، قربانیاں دیں اور شہید ہوئے۔

"گلِ تر" کی بعض نظموں اور غزلوں میں جو حسین رومانی فضا ملتی ہے جام و مینا میں تلخیوں کو گھول دینے کی جو باتیں ملتی ہیں، اس کی وجہ سے مخدوم کی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ احساس بھی

ہوتا ہے کہ شاعرِ انقلاب نے اب محبت کو بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں جسمانی محبت کو اکسیر بنالیا ہے۔ "جانِ غزل" میں شاعر کو ایک اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل نظر آجاتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اب "چشمِ نم" دل کھول کر مسکرائے اور خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں دو گھڑی بیٹھ کر عشرتِ حال کی مے پی جائے۔ شاعر کو پچھلے سفر کے بھاری پن کا احساس ہے۔ اس لیے رخسار کی چھٹکی ہوئی چاندنی میں وہ تصور کرتا ہے کہ تلخیوں کی بدلیاں چھٹ گئی ہیں اور پیچ و خم کھل گئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ کہ ایسے میں دنیا کے غم یاد آئیں۔

مخدوم کی شاعری کا یہ لہجہ یقیناً تھکے ماندہ سیاست داں اور انقلابی کی حسن و عشق کی دل کش فضاء میں سستانے کی خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ مخدوم کو یہ لہجہ بدلے ہوئے حالات، زندگی کے ہنگاموں، حادثات اور تلخیوں نے عطا کیا ہے۔

"گلِ تر" میں مخدوم نے حسن و عشق کے معاملات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ حقیقی حادثات کی صدائے بازگشت ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے اس موڑ پر عشق کا کوئی حقیقی تجربہ انھیں ہوا ہے۔ بہر حال وہ کسی جانِ غزل سے بڑی شدت کے ساتھ متاثر نظر آتے ہیں۔ رنگین رومانی ماحول کو وہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

روشن ہے بزم شعلہ رُخاں دیکھتے چلیں
اس میں وہ ایک نور جہاں دیکھتے چلیں

سرگوشیوں کی رات ہے رخسار ولب کی رات
اب ہو رہی ہے رات جواں دیکھتے چلیں

آ ہی گئے ہیں رقص گہ گُل رخاں میں ہم
کچھ رنگ و بو کا سیلِ رواں دیکھتے چلیں

•

"گُلِ تر" شائع ہونے کے بعد مخدوم نے دس نظمیں لکھی ہیں جن میں سب کی سب آزاد نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں "لختِ جگر" "دھنک" "وصال" "نہرو" "سب کا خواب" اور "وقت بے درد مسیحا" قابلِ ذکر ہیں۔

"لختِ جگر" میں مخدوم نے بڑے موثر انداز میں ان بچوں کے مسئلے کو چھیڑا ہے جنھیں "ناجائز اولاد" کہا جاتا ہے۔ اس نظم میں تلقین کا انداز کہیں نہیں ملتا بلکہ ایک تاثر فن کارانہ حُسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ وہ تاثر یہی ہے کہ یہ عجیب سماج ہے جس میں محبت کی نشانی "لختِ جگر" کو تک اپنایا نہیں جا سکتا بلکہ گناہ تصوّر کر کے اسے گہرے کنویں میں پھینک دیا جاتا ہے حالانکہ کوئی بھی "لختِ جگر" دنیا کا بلکہ تاریخ کا بڑے سے بڑا

آدمی بن سکتا ہے، انسانیت کا ہادی کہلایا جا سکتا ہے جسے لوگ خدا کا تک درجہ دے چکے ہیں۔

کوئی ماں

کئی سال پہلے

زمانے کے ڈر سے

سرِ رہگزر

اپنا لختِ جگر چھوڑ آئی

وہ ناخواستہ طفلکِ بے پدر

ایک دن

سولیوں کے سہارے

بنی نوعِ انساں کا ہادی بنا

پھر خدا بن گیا

سماج کے قیود اور بندھن ایسے ہیں کہ اعترافِ گناہ کی تو جراءت نہیں ہوتی لیکن لختِ جگر کو گہرے کنویں میں پھینک دینے کا گناہ ضرور سرزد ہوتا ہے۔ نظم میں ہر بات صاف اور کھل کر نہیں کہی گئی ہے لیکن یہ ادھوراپن نظم کی خامی نہیں بلکہ خوبی ہے۔

"دھنک" نظم "دھنک" (خواہشیں) میں رنگارنگ خواہشوں کو دھنک کہنا یا پھر ان خواہشوں کو دل کی "اندر سبھا" کی پریوں

کا نام دینا خوب صورت انداز بیان ہے۔ یہ پریاں جام میں انگڑائیاں لیتی ہیں اور جام میں کسی ماتھے کا سایہ بھی نظر آتا ہے یہ اظہار بیان خوب ہے۔

جام میں تیرے ماتھے کا سایہ گرا
گھل گیا
چاندنی گھل گئی
تیرے ہونٹوں کی لالی
تری نرمیاں گھل گئیں
رات کی ان کہی ان سنی داستاں
گھل گئی جام میں

پوری نظم جاگتی ہوئی خواہش کی طرح تھرکتی ہوئی ایک عجیب تاثر چھوڑتی ہے۔ یادیں اور تصورات پرچھائیوں یا متحرک تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ یہ مختصر نظم آزاد نظم میں غنائیت اور آہنگ پیدا کرنے کی اچھی مثال ہے۔

"وصال" میں "لخت جگر" کی طرح ایک سماجی مسئلے کی طرف اشارہ ہے۔ عورت اور مرد کے ملاپ (وصال) میں روپیہ پیسہ مذہب، ذات پات اور رنگ و نسل کی جو صدہا رکاوٹیں حائل تھیں، وہ اس نظم کا موضوع ہیں۔ یہ رکاوٹیں آج بھی موجود ہیں لیکن شاعر اس فرق کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ اب بوڑھی اور فرسودہ

روایتیں اس ملاپ پر آنسو بہا سکتی ہیں ڈس نہیں سکتیں۔کیونکہ زمانے نے ان کی قوتِ جبر کو روند دیا ہے۔

اس نظم میں — "دولت خاں کی دیوڑھی — اور اس پر کھڑا — "بوڑھا ناگ" — جو پہلے ڈستا تھا اور اب صرف "کھڑا روتا ہے" یہ سب ایسے اشارے ہیں جو اس مفہوم کو بڑی عمدگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ آزاد نظم میں حُسنِ بیان اور نغمگی کے ساتھ سنجیدہ تفکر اور تجزیہ کی یہ نظم اچھی مثال ہے۔

پنڈت نہرو کی موت پر مخدوم نے جو مختصر سی نظم لکھی ہے وہ بہت پُر اثر ہے۔

ہزار رنگ ملے اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گُل کا غبارِ مُشتِ بہار
ہوا ہے وادیِ جنت نشاں میں آوارہ
قضا کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

پنڈت نہرو کی موت پر بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں۔لیکن مخدوم کی یہ مختصر نظم جو بالواسطہ طور پر تاثر کا اظہار ہے غیر روایتی بھی ہے

اور خوب صورت بھی ۔۔۔

"سب کا خواب" میں مخدوم نے علی الاعلان اشتراکی کیمپ میں پھوٹ اور انتشار پہ آنسو بہائے ہیں۔ اشتراکی کیمپ میں روس اور چین کے زیر اثر دو کیمپوں کے قیام اور نقاطِ نظر اور مفادات میں ٹکراؤ کو دیکھ کر شاعر ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب ہر اشتراکی کا خواب ایک تھا ایک مقصد اور ایک منزل تھی۔

وہ شبِ مے، وہ شب مہتاب، میری ہی نہ تھی
وہ تو سب کا خواب تھا

وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا، میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا

دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے کے باوجود سب ایک تھے
اتحادِ عمل تھا

لاکھ دل ہوتے تھے لیکن

جب دھڑکتے تھے تو ایک دل کی طرح

جب مہک اٹھتے تھے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
والگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل

لیکن نہیں معلوم کیا ہوگیا کہ اب یہ اعتماد اور ہم آہنگی باقی نہیں۔

"وقت بے درد مسیحا" میں شاعر موجودہ دور کے درد و کرب کی رات تصور کرتا ہے۔ وہ درد کو مرہم بنانے کا قائل نہیں بلکہ یہ چاہتا ہے کہ امرت بھری انگلی درد کا درماں کرے کیوں کہ اس سے دل کو آرام پھپولوں کو سکون ملتا ہے شاعر کو یقین ہے کہ وقت جو بے درد مسیحا ہے اس درد کی رات کی نبض میں نشتر رکھ سکتا ہے۔ نظم اس آرزو پر ختم ہوتی ہے کہ ؎

وقت

او مشفق و محسن قاتل!

رات کی نبض میں نشتر رکھ دے

رات کا خوں ہے

بہہ جاتا ہے

بہہ جانے دو

اس نظم میں وقت، عمل تغیر و ارتقا کی علامت ہے۔ وقت کے مفہوم میں انسان کی اجتماعی کوششوں اور جہدِ حیات کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس نظم میں تاثر اور تجسس اور ابہام کا عنصر نمایاں ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب آزاد نظم ہے جس میں الفاظ کا استعمال نظم کے لہجے اور ماحول کی مناسبت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں اظہارِ بیان کی روانی کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔

زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو
زخم کے ماتھے سے امرت بھری انگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام پھپولوں کو سکوں ملتا ہے

اور پھر یہ اظہار بیان

قبر سے اُٹھ کے نکل آئی ملاقات کی شام
ہلکا ہلکا سادہ اُڑتا ہوا گالوں کا گلال
بھینی بھینی سی وہ خوشبو کسی پیراہن کی

•

درد کی کاہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات

فن کارانہ حُسن کی اچھی مثالیں ہیں۔

•

مخدوم کے مجموعۂ کلام میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ اِکا دُکا قطعات اور چیدہ چیدہ چند اشعار بھی ملتے ہیں ان کا یہ شعر

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

بلاشبہ ان کے منتخب اشعار میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ شعر مخدوم ہی کے نہیں اردو کی جدید شاعری کے منتخب اشعار میں جگہ پاسکتا ہے زبان زد خاص و عام اس شعر میں مخدوم کے فکری میلان، شخصیت اور زندگی اور فن کی جانب ان کے رویہ کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

مخدوم کی شاعری کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ لے کر ان کے مقام کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ اردو کے تنقید نگاروں میں کسی نے مخدوم کی شاعری پر تفصیل کے ساتھ کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھا ہے۔ مختلف تنقیدی مضامین اور بعض کتابوں میں جو حوالے ملتے ہیں وہ اس جانب رہنمائی کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مخدوم کی شاعری کے صاف، واضح اور بڑی حد تک غیر نزاعی ہونے کے باوجود ان کی شاعری کے مقام کے تعین میں صاف اور واضح اشارے کیوں نہیں ملتے۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں۔ پہلی اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ مخدوم نے (۳۰) سال سے زائد مدت میں مشق سخن کے ذریعے جو شعری سرمایہ چھوڑا

ہے وہ مقدار میں بہت تھوڑا ہے۔ دوسری وجہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۶ء تک کا طویل درمیانی وقفہ ہے۔ (۱۲) سال کی اس مدت میں مخدوم نے صرف چند ہی نظمیں لکھی ہیں جن میں شاید کوئی بھی چونکا دینے والی نہیں ہے۔ اس دوران میں ادبی دنیا "سرخ سویرا" کو ہی ان کی شاعری کا حرف آخر سمجھنے لگی تھی۔ لیکن "گُلِ تر" کی اشاعت اور اس کے بعد بھی چند اچھی نظموں کا شائع ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے نقاد مخدوم کی شاعری پر گہری نگاہ ڈالیں اور تفصیل کے ساتھ اس کے محاسن اور معائب کا جائزہ لیں ...

اس "گہری نگاہ" اور "مفصل جائزہ" کی غیر موجودگی میں مخدوم کی شاعری کا مطالعہ کرنے والے ادب کے کسی بھی طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ بتوسط شعر ہی شاعر اور اس کی شاعری کی اہمیت اور مقام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

مخدوم کی شاعری کی بعض اہم خوبیاں خود شاعر اور اس کے تفکر سخن کے لیے رکاوٹ یا پابندیاں بن جاتی ہیں۔ مخدوم بنیادی طور پر آرٹسٹ ہیں کاریگر نہیں۔ ان کا جو کچھ بھی شعری سرمایہ ہے اس میں ایسا فن کارانہ حسن ہی بکھرا ہوا نظر آئے گا جو غیر شعوری تخلیق عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ بے ساختگی اور آمد کے قائل نظر آتے ہیں۔ شعوری طور پر شعر موزوں کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔

ان کے نزدیک عمل تخلیق ایک خود رو پودے کے وجود میں آنے یا کسی چشمے کے خود بخود پھوٹ پڑنے کے عمل سے مشابہ ہے۔ مشق و ریاضت اور صناعی و کاریگری کے ذریعے کبھی وہ اپنے نتیجہ سخن کو موتیوں کی چمکتی لڑی بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ گہر خود بخود سینۂ صدف سے باہر آ جائیں۔ وہ اس اصول اور ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے کہ موتی چُن کر نکالنے کے لیے ہر صدف کا سینہ چیرنا پڑتا ہے اور بڑی جانکاہی اور ریاضت کے بعد ہی کچھ موتی ہاتھ آتے ہیں۔

مخدوم کی شاعری کی اس خصوصیت کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ ان کے اشعار میں آمد آمد اور موسیقیت کا احساس شروع سے آخر تک ہموار اور یکساں طور پر ملتا ہے۔ کہیں "آورد" یا دانستہ کوشش نظر نہیں آتی۔ اس رجحان اور اس مزاج کا شاعر اگر کسی نظامِ فکر سے وابستہ ہو تو اس کی شاعری کا دائرہ اور تنگ ہو جاتا ہے۔ عقیدہ پرستی کی وجہ سے تخیل کی دنیا یا تو محدود ہو جاتی ہے یا پھر شعوری اور غیر شعوری طور پر لمحۂ محدود بنا لیا جاتا ہے۔ فکر و خیال کو وسعتیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تامل اور جھجک کی وجہ سے بھی تخلیقی سوتے خشک ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ادبی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں شاہد ہیں کہ اچھے تخلیقی فن کار زندگی کے دوسرے شعبوں میں اپنی مصروفیت

کی وجہ سے اپنے اندر کے فن کار کو مستقلاً حالتِ سکون میں پہنچا دیتے ہیں۔ فن کار خاموش ہو جاتا ہے اور خاموشی اس کے نغموں کی زبان بن جاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس کی بہترین مثال ہیں۔ اس طرح سیاست نے کتنے ہی اچھے ادیبوں اور شاعروں کو ادب اور شاعری کے میدان سے چپ چاپ ہٹا دیا ہے مخدوم نے اگر اپنے آپ کو شاعری کے لیے وقف نہیں کر دیا اور مطالعہ سوچ وبچار اور ریاضتِ شعر پر زیادہ توجہ نہیں کی تو اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا وہ "گنجِ گرانمایۂ عمر" جو تخلیقی سرگرمیوں سے ہٹ کر سیاسی ٹریڈ یونین اور دوسری سرگرمیوں کی نذر ہوا نذرِ شعر وسخن نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں وہ قادرالکلامی نظر نہیں آتی جو ان کے درجہ کے شاعر کا حصّہ ہوتی ہے۔ انھوں نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت تک وہ اردو اور فارسی کے ادب بالخصوص شاعری کا اچھا مطالعہ کر چکے تھے۔ انگریزی کے نمائندہ شعرا کو بھی انھوں نے پڑھا تھا اور بنگالی، روسی اور عالمی ادب کے دیگر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے بھی انھوں نے انگریزی کے توسط سے شناسائی حاصل کی تھی۔ اس زادِ راہ کے ساتھ انھوں نے شاعر کی حیثیت سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ وہ بھی اس وقت جب ان کے اندر کا شاعر خود بخود باہر آ گیا۔ اس سے پہلے وہ اچھے شعر سے لطف اندوز ہونے

اور اچھے شعروں کو گنگنانے اور ترنم سے پڑھنے کے عمل کو ایک "تخلیقی عمل" بنائے ہوئے تھے۔ وہ اب بھی اس بات کے قائل ہیں کہ[1]:-

"شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بدلتا جاتا ہے۔ شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا جاتا ہے۔ بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے۔"

مخدوم کے قریبی دوست احباب نے جب دیکھا کہ مخدوم دوسروں کے شعر سناتے ہوئے شعر کی فضا کو باز تعمیر کر دیتے ہیں۔ خود بھی کھو جاتے ہیں اور سننے والوں کو بھی اس فضا میں پہنچا دیتے ہیں تو ان کے احباب نے رائے ظاہر کی کہ مخدوم کو خود بھی شعر کہنا چاہیئے۔

یہ نشان دہی شاعر مخدوم کی دریافت کا سبب بنی۔ ان کی ابتدائی نظموں نے ہی دنیائے ادب کو چونکا دیا۔ برسوں کی مشق سخن کے بعد نہیں بلکہ ابتدائی مشق سخن نے ہی انھیں ایک قابل توجہ اور اہم شاعر بنا دیا۔ اس کے بعد چند سال تک مخدوم پر شاعری کا موڈ چھایا ہوا رہا۔ پھر اشتراکی تحریک اور سیاسی سرگرمیوں نے

---

[1] "گل تر" ــ پیش لفظ بعنوان "پڑھنے والوں سے" صفحہ

انھیں دعوت دی اور انھوں نے اس دعوت کو اپنی شاعری کی قیمت پر قبول کرلیا۔

مخدوم کا شعری سرمایہ محدود اور کم ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے وقتی ہنگاموں کے زیر اثر موضوعاتی نظمیں لکھنے سے بالعموم پرہیز کیا ہے۔ مطالعہ اور مشق و ریاضت سے دوری کے باعث انھوں نے نہ تو ہیئت میں تجربے کرنے کی کوششیں کیں اور نہ ہی پرچار، تلقین اور خطابت کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا۔ خطابت کو شاعری کے درجے تک پہنچانے کی بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ یہ بات نہ تو ان کے شاعرانہ مزاج سے مطابقت رکھتی تھی اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو فنی اعتبار سے اس کے لیے موزوں تصور کر سکتے تھے۔ اس طرح مخدوم اپنی شاعری کے دائرے کو وسیع تو نہیں بنا سکے۔

ان کی ابتدائی نظموں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی شاعری میں ہیئت اور مواد میں تجربہ کرنے اور اظہار بیان کے نئے سانچے تیار کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ ان کی بعض ابتدائی آزاد نظمیں بھی بڑی کامیاب اور نمائندہ ہیں۔ اردو کے جن شعراء نے آزاد نظم کی تکنیک میں توازن اور آہنگ کا خاص خیال رکھا ہے ان میں بلا شبہ مخدوم بھی شامل ہیں۔ تقریباً سات سال قبل انھوں نے غزلوں کی جانب توجہ شروع کی اور مختصر عرصے میں کئی غزلیں

موزوں کرکے یہ تاثر پیدا کیا کہ وہ جدید غزل کے اچھے اور نمائندہ شاعر کہلائے جا سکتے ہیں۔ ان صلاحیتوں کے باوجود مشق و ریاضت سے اجتناب بلکہ زیادہ صحیح معنی میں اپنے آپ کو شاعری کے لیے وقف نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ ہر راہ سے گزرتے ہوئے تو نظر آتے ہیں لیکن کہیں بھی دیر تک رک کے دم نہیں لیتے پھر بھی ہر راہ پر ان کے جو نقش قدم ملتے ہیں، ان میں گہرے، باقی رہنے والے اور رہنمائی کرنے والے نشان بھی شامل ہیں اور یہی ان کے شعر کی بڑائی ہے۔ جس زمانے میں سیاسی اور انقلابی شاعری کا مفہوم واضح نہ ہو سکا تھا مخدوم نے سائنٹفک فکر اور عقلیت کی مدد سے اسے واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس معاملے میں وہ مجاز، فیض اور جعفری سے آگے نظر آتے ہیں۔ رومان اور انقلاب کو ہم آہنگ کرنے میں بھی مخدوم کا شمار بانیوں میں ہوتا ہے۔

انقلاب کا مفہوم واضح ہونے کے بعد کسی نے انتہا پسندی کا لہجہ اپنایا اور اپنی شاعری کو نزاعی بنانے کے باوجود اس میں بڑی وسعتیں پیدا کیں تو کسی کے مزاج میں ٹھہراؤ اور گہری سنجیدگی نے رمز و اشاریت اور شاعری میں گداز پیدا کر دیا لیکن مخدوم کی شاعری میں ایک آنچ کی کمی کی شکایت باقی رہ گئی۔

۱۹۵۶ء میں مخدوم کی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی "چارہ گر" "چاند تاروں کا بن" اور اس کے بعد مسلسل کئی غزلوں کی اشاعت

سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سیاسی ہنگاموں سے تھک کر شاعر پھر اپنی دنیا میں واپس ہو چکا ہے لیکن یہ توقع بھی پوری نہیں ہوی. کیونکہ سیاسی اور مجلسی زندگی شاعر کی زندگی اور شخصیت پر کچھ اس طرح مسلط ہو چکی ہے کہ وہ اسے چھوڑنا چاہے تو بھی نہیں چھوڑ سکتا "چارہ گر" سے مخدوم نے اپنی شاعری کے دائرے کو وسعت بھی دے دی۔ بہت سی خود عائد کردہ پابندیوں اور حد بندیوں کو توڑا۔ رمز و اشاریت اور ابہام کو راست اظہار کی جگہ دینا شروع کی لیکن ان سب تبدیلیوں اور اصلاحات کے باوجود بھی ہمیشہ موڈ کے تابع رہنے کی ان کی قدیم عادت نہ بدلی. مشق و ریاضت، عمیق مطالعہ اور گہری فکر کے لیے ہنوز انھیں فرصت اور پُر سکون حالات میسر نہ آسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ۳۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ان کے ذخیرۂ الفاظ میں کوئی اہم یا نمایاں اضافہ نظر نہیں آتا۔ یہی بات قدرتِ بیان کے ضمن میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

شاعری میں فکر، خیال یعنی مواد کو بنیادی اہمیت ضرور حاصل ہے لیکن اظہار بیان، زبان، الفاظ، تراکیب، بندشوں، استعاروں اور تشبیہات وغیرہ کی اہمیت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری اگر جذبات و احساسات اور روح کی زبان ہے تو پھر اس زبان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے موزوں اسلوب اور مناسب الفاظ کا استعمال بھی خاص اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ مخدوم کو ہیئت

کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہے انھوں نے روایتی انداز بیان، روایتی اسلوب اور دوسری گھسی پٹی روایات پر کبھی عمل نہیں کیا۔ مخدوم نے جب آزاد نظمیں لکھنا شروع کیں تو آزاد نظم اردو کی جدید شاعری میں ایک نیا تجربہ تھی ۔ اس زمانہ میں تصدق حسین خالد، ن۔م۔ راشد اور میرا جی نے آزاد نظم پر بھرپور توجہ کی۔ بعد میں سردار جعفری نے آزاد نظم کی سرحدوں کو وسیع کیا۔ مخدوم کا نام بھی ان شعراء کے ساتھ آزاد نظم میں کامیاب تجربوں کے لیے لیا جاتا ہے۔

مخدوم کی شاعری کے فنی محاسن میں یہ خوبی بھی شامل ہے کہ وہ فارم اور الفاظ کے انتخاب کو عمل تخلیق کا ایک جز تصور کرتے ہیں۔ نظم لکھنے یا غزل موزوں کرنے کے بعد فوری اپنے احباب کو سنا دیتے ہیں سنانے کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے نتیجہ میں ان کی نظم یا غزل روزنامۂ سیاست (حیدرآباد) میں شائع ہو جاتی ہے۔ پھر کسی ہفتہ وار یا پھر کسی ماہنامے کی قریبی اگلی اشاعت میں بھی موجود ہوتی ہے۔ وہ شعر کہنے کے بعد اس پر دوبارہ غور نہیں کرتے الفاظ، تراکیب، بندش اور تشبیہہ و استعاروں کو مزید تولتے اور پرکھتے نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا عمل کاریگری کی تعریف میں آتا ہے لیکن یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ شعر جو بھی خارجی شکل اختیار کر چکا ہے وہ موزوں ترین شکل ہے غور و خوض، خود احتسابی خود اپنی تخلیق پر تنقیدی نگاہ نظم میں بہتر

ربط و تسلسل اور بہتر آہنگ پیدا کر سکتی ہے اور اس عمل سے معنی اور مفہوم میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔

بڑا شاعر اپنے اظہار کے لیے جو سانچے منتخب کرتا ہے جس فارم کو اپناتا جن الفاظ کو چنتا، جن تشبیہوں اور استعاروں کے نگینوں سے مینا کاری کرتا ہے وہ اس کے شعر ہی کے تاثر اور آب و تاب میں اضافہ نہیں کرتے زبان اور شاعری کو بھی وسعت عطا کرتے ہیں اس عمل کے دوران الفاظ کے معنی اور مفہوم میں گہرائی پیدا ہوتی ہے نئی تراکیب اور نئے الفاظ بنتے اور زبان میں بلند خیال اور بلند فکر کے اظہار کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مخدوم کے پاس فارم اور الفاظ کے انتخاب میں تخلیقی شان ضرور ملتی ہے لیکن تشبیہ اور استعاروں کی جانب وہ زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ تاثر کی شدت میں اضافے کے لیے وہ تکرار کی جانب بھی زیادہ مائل نظر نہیں آتے۔ اس عمل کاریگری کے لیے بڑی محنت اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخدوم کی گوناگوں مصروفیات اور مزاج کا لاابالی پن اس ریاضت کا متحمل نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مخدوم نے کوئی طویل نظم نہیں لکھی۔ مخدوم اختصار پر قناعت کرکے اسے خوب تر بنا لیتے ہیں لیکن اختصار سے غیر مطمئن ہو کر مزید تجسس، تلاش اور جگر سوزی کے مراحل سے گزرنا نہیں چاہتے ورنہ وہ اپنی تقریباً تمام نظمیں ایک ہی نشست میں نہیں لکھتے۔ لیکن اس "آمد"

کی وجہ سے ان کی شاعری میں جو موسیقیت پیدا ہوی ہے نے انہیں اپنے ہم عصر شعراء میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

مخدوم جب اپنے شعر سناتے ہیں، تو بہت ڈوب کر خوش الحانی کے ساتھ لہک لہک کر سناتے ہیں خود شعر سناتے ہوے بڑا لطف لیتے ہیں اور اپنے اشعار کی موسیقی سے سامعین کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ایسے سامعین بھی جو ان کے اشعار کے معنی اور مفہوم کی گہرائی کو سمجھ نہیں سکتے ان اشعار کے ترنم اور موسیقیت سے متاثر ہوے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مخدوم کی شاعری کی اس خصوصیت نے انھیں حد درجہ مقبول اور محبوب شاعر بنا دیا ہے۔

یہ کہنا کہ مخدوم کی اس بے پناہ مقبولیت کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ایک بڑی شخصیت ہیں ایک ممتاز سیاسی رہنما، نامور ٹریڈ یونین قائد اور سماجی و تہذیبی زندگی میں ممتاز مقام رکھنے والے ممتاز شہری ہیں، صحیح نہیں ہے۔ مخدوم کو اس زمانے میں بھی لوگ دیوانہ وار چاہتے تھے جب وہ سیاسی رہنما نہیں تھے اور جب ان کا سماجی رتبہ اور مقام اتنا بلند نہیں تھا۔ ہاں یہ صحیح، عین فطری بات اور منطقی نتیجہ ہے کہ سیاسی رہنما اور ممتاز شہری کی حیثیت سے شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے بحیثیت شاعر کے بھی زیادہ جانے پہچانے شاعر ہیں اور ان کے چرچے بھی انہیں سننے، ان کی شاعری کو پڑھنے اور اس پر غور و خوض کرنے کے محرک

ہوا کرتے ہیں۔ مخدوم حیدرآباد میں بے پناہ مشہور اور مقبول ہیں بہت کم کوئی شاعر مخدوم کی طرح اپنے وطن یا علاقہ میں اس درجہ مشہور اور مقبول نظر آتا ہے۔ لیکن مخدوم کی مقبولیت کا اندازہ ان کی حیدرآباد کے حلقوں میں مقبولیت سے ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ جہاں تک ادبی نقاد کا تعلق ہے وہ کسی ادیب یا شاعر کی اس شہرت اور اس کے چرچوں کو بنیاد بنا کر اس کے ادبی مقام کا تعین نہیں کرتا اگر ایسا ہوتا تو بہت سے گلہ باز شاعر یا ایسے شاعر جنہیں محض فلم سے وابستگی کی وجہ سے زبردست شہرت مل گئی ہے اچھے اور بڑے شاعر کہلاتے ۔

مخدوم کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ان کے مقام کا تعین کرتے وقت سب سے پہلے تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کس دور میں وہ ایک اہم شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور اس وقت ان کے ہم سفر کون تھے۔ ظاہر ہے کہ رہنماؤں سے موازنہ اور تقابل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک کے دہے کو اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جدید شاعری کی جو روایات غدر کے بعد حالی اور محمد حسین آزاد کے زیر اثر آگے بڑھی تھیں وہ اقبال اور جوش تک پہنچتے پہنچتے ارتقا کی اس منزل پر پہنچ چکی تھیں کہ ہماری شاعری اب حقیقی معنیٰ میں اپنے دور کی ترجمان بن چکی تھی لیکن

رومانیت اور جذباتیت کے مفہوم واضح نہیں ہوئے تھے عقل
وجنوں میں توازن پیدا کرنے کا کام رہنماؤں نے نئی نسل پر
چھوڑ دیا تھا جو مغربی ادب اور مغربی فلسفہ اور رجحانات کے
زیر اثر شعر و ادب کو صحیح معنٰی میں نقد حیات بنانے کا حوصلہ رکھتی
تھی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ابھرنے والے نوجوان ترقی پسند شعرا میں
جنھوں نے اپنے ذہن کے دریچے نئے خیالات اور رجحانات کا
خیر مقدم کرنے کے لیے کھلے رکھے تھے اور جن کے دل آزادئ
وطن اور انقلاب کے جذبے سے معمور تھے تھوڑے تھوڑے
وقفے سے مجاز، مخدوم محی الدین، فیض، جذبی اور سردار جعفری
نمایاں ہوئے۔ ن م راشد پہلے ہی اپنی الگ آواز کے ذریعے
چونکا چکے تھے وہ فکر و خیال کے لیے سانچوں کی تلاش اور
ہیئت کے نئے تجربوں میں مگن تھے۔ راشد نے اپنے ہم عصر
تمام نوجوان شعراء کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ جدید شاعری
میں آزاد نظم کے لیے ایک خاص مقام پیدا کرنے والوں
میں یقیناً راشد کا نام سر فہرست ہے۔ راشد اور میراجی کے
تجربوں نے فکر و خیال کے اعتبار سے ہی نہیں اظہار اور ہیئت
کے اعتبار سے بھی ہماری شاعری پر اہم اثرات مرتب کیے ہیں
آزاد نظم کو متعارف کرانے کے بعد اس کی زلفیں سنوارنے
والے چند اہم شعرا میں مخدوم محی الدین بھی شامل ہیں۔ راشد کی

کی طرح ان کی آزاد نظم میں بھی ربط و آہنگ کے ساتھ بڑی غنائیت پائی جاتی ہے۔ لیکن فکر و خیال کے معاملے میں راشد بڑے متنازعہ فیہ شاعر رہے ہیں۔ راشد کی شاعری میں فرار، یاس و مایوسی اور کلبیت کے رجحانات محسوس کرنے والوں نے ان پر سخت تنقیدیں کیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کا زور بڑھا تو راشد کی شاعری میں سے چُن چُن کر منفی رجحانات نکالے جانے لگے لیکن مخدوم نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی فکر کے دائرے کو محدود رکھا۔ ابتدا میں ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں جھنجلاہٹ، بیزاری، اور تخریب و دہشت کے رجحانات ملتے ہیں لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی دوسری اہم نظموں کے ذریعے ثابت کر دیا کہ وہ توازن اور اعتدال پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سائنٹی فک انداز فکر اور عقلیت کو انھوں نے جذبہ اور احساس کے اظہار واقعی پر ترجیح دی۔ انقلابی شاعری کے مفہوم کو سب سے پہلے مخدوم نے ہی واضح کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ مجاز رومان کے ترانے گاتے رہے اور رومان سے انقلاب تک کے سفر میں انھوں نے اپنے لہجے کی نرمی، گداز، زندگی سے، پیار اور رچے ہوئے جمالیاتی شعور کے باعث ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کے پورے دور کی شاعری کو متاثر کیا۔ مخدوم کی طرح وہ بھی زندگی سے بھرپور انداز میں پیار

کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دورِ حاضر کے مسائل اور تلخیوں کے بیان کے باوجود شگفتگی ملے گی۔

ترقی پسند شاعروں میں سیاسی شاعری کی روایات کو پہلے مخدوم نے اور بعد میں سردار جعفری نے بھرپور انداز میں آگے بڑھایا۔ فیض احمد فیض کا تعلق بھی اگرچہ اسی نظامِ فکر سے تھا جس سے مخدوم، مجاز اور جعفری وابستہ تھے لیکن جذبہ، احساس اور اپنے اشعار میں ایک کیفیت پیدا کرنے کی کوشش میں انھوں نے اپنے لیے ایک علٰحدہ راہ نکال لی۔ فیض نے بہت کم سیاسی نظمیں کہی ہیں۔ وہ اشاروں، کنایوں اور بالواسطہ اظہار کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کے خوب صورت اشارے اور کنایے ادائے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیتے ہیں۔ جو بات صاف صاف طور پر بیان کی جائے اس کا تاثر دیرپا نہیں ہوتا ہے لیکن خوب صورت کنایوں اور اشاروں میں ادا کی ہوئی بات ایک ایسی حقیقت اور صداقت بن جاتی ہے جو ہر زمانے کے لیے ہوتی ہے۔ مخدوم کی شاعری میں فیض کا داخلی گداز اور سپردگی "سرخ سویرا" کی نظموں میں کم ملتی ہے لیکن "چارہ گر" "چاند تاروں کا بن" اور بعض دوسری نظموں اور غزلوں میں سوز و گداز بھی ملتا ہے۔ مخدوم پہلے شاعر تھے جنھوں نے پہلی بار جنگ کے خلاف اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا اور جنگ کے "پسِ پردہ عفریتِ سیم و زر"

کو کارفرما دیکھا۔ اپنے ہم سفر ترقی پسند نوجوان شعرا میں مخدوم کے فن وسماجی شعور نے تیزی کے ساتھ ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں جس کا اندازہ ان کی نظموں، جنگ، مشرق، دھواں، آزادی وطن اور زلفِ چلیپا سے ہو سکتا ہے۔

سردار جعفری سیاسی شاعری کے میدان میں بعد میں آگے نکل گئے۔ انھوں نے جدید شاعری بالخصوص آزاد نظم کو نئی وسعتیں عطا کیں لیکن راست اظہار کو انھوں نے خطابت، پرچار اور پروپگنڈے میں تبدیل کر دیا۔ خطابت کو شاعری بنانا اس میں شک نہیں کہ ایک معجزہ سے کم نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں سردار جعفری کی کوششوں کو بڑی اہمیت ضرور حاصل ہے لیکن محدود کامیابیوں کے ساتھ ہی ساتھ انھیں ناکامیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کہیں جذبات سے مغلوب ہو کر اور کہیں تلقین اور خطابت کو فرض اور شاعر کا پیام جان کر انھوں نے انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ مخدوم کی شاعری اس سطحیت اور نعرہ بازی سے بڑی حد تک پاک رہی۔ "سرخ سویرا" کی شاعری ۱۹۴۴ء تک کی شاعری ہے۔ ۱۹۴۴ء تک مخدوم مجازؔ، فیضؔ اور راشدؔ کے ساتھ اپنے لیے اہم مقام بنا چکے تھے۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصے میں مخدوم نے بہت کم نظمیں لکھی ہیں۔ اس دوران میں ان کے ہم عصر شعرا میں فیضؔ نے اپنے فنی ارتقا کے ذریعے اہم مقام

حاصل کرلیا۔ راشد کی شاعری کی اہمیت کو گھٹانے کا رجحان کمزور پڑتا گیا اور راشد کو ان کا منفرد مقام مل گیا۔ مخدوم نے اپنی "گلِ تر" کی شاعری کے ذریعے جس میں ان کی بہترین نظم "چاند تاروں کا بن" شامل ہے، یہ ثابت کیا کہ وہ سو تو رہے تھے لیکن "ساز پر سر رکھ کر"۔ ان کے اندر کے شاعر نے اپنی گلِ تر کی شاعری کے ذریعے بھی جدید شاعری میں اپنے تازہ پھولوں کی مہک شامل کی۔ غزل کی جانب متوجہ ہو کر مخدوم نے ثابت کیا کہ وہ غزل کی شاعری میں اپنے ہم عصر کسی بھی دوسرے شاعر سے پیچھے نہیں۔ ان کے دوسرے مجموعے "گلِ تر" کی اشاعت کے بعد ان کی چند اچھی اور خوبصورت نظمیں شائع ہوئی ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ تمام شعرا میں جو ترقی پسند یا جدید شاعری کی نمائندگی کرتے ہیں، مخدوم بلا شبہ ممتاز ترین شاعروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ مخدوم کے علاوہ دوسرے اہم شاعر علی سردار جعفری ہیں۔ مخدوم اور علی سردار جعفری کے علاوہ اختر الایمان کو جدید شاعری میں ممتاز مقام حاصل ہے لیکن چونکہ ان کی شاعری کا رنگ مزاج اور لہجہ مختلف ہے، اس لیے وہ مخدوم و سردار جعفری کے زمرے میں شامل نہیں کیے جا سکتے۔ وہ ایک علٰحدہ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم کے ساتھیوں میں مجاز کا انتقال ہو چکا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں جذبی نے بھی اپنے لیے اہم جگہ بنالی تھی لیکن طویل عرصہ سے وہ بجھے بجھے سے ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری سیاسی ہنگاموں کا زور ختم ہونے کے بعد ایک نئی کروٹ لے چکی ہے۔ مخدوم کے فکری و شعری مزاج میں جو تبدیلی آئی ہے اس کا ذکر "گل تر" اور اس کے بعد کی شاعری کے جائزے میں کیا جا چکا ہے۔

فیض، مجاز، مخدوم اور جعفری کے بعد ترقی پسند تحریک نے جو اچھے شاعر دیئے ہیں، ان میں مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی شامل ہیں اور سب کے سب فلمی صنعت سے وابستہ ہونے کے نتیجے میں اپنے پیشے کی مصروفیات میں ہی گم نظر آتے ہیں۔

مجروح غزل کے اچھے شاعر ہیں۔ مجروح کے یہاں اردو کی قدیم اور روایتی غزل کی لطافت اور رچاؤ ملتا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے دیگر مسائل کو بھی غزل میں پیش کرنے کا تجربہ کیا ان کے یہاں غزل میں قدیم اور جدید رنگ کا امتزاج ملتا ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے جو کام نظم سے لیا وہ انھوں نے غزل سے لینے کی کوشش کی۔ اپنے بعض تجربوں میں وہ ناکام بھی رہے لیکن مجموعی طور پر غزل کے آہنگ اور غزل کے کہنے کے سلیقے کو

انھوں نے برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح غزل کے جدید شعرا میں انھوں نے خاص جگہ اور مستقل مقام بنالیا۔

جان نثار اختر بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ ان کی سماجی شاعری میں بھی رومانی رنگ جھلکتا ہے۔ انھوں نے بعض طویل سیاسی نظمیں بھی لکھی ہیں وہ ان کے مزاج کی غمازی نہیں کرتیں لیکن اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وہ چند اچھی انقلابی نظمیں پیش کر چکے ہیں جن پر جوش کا اثر بھی ملتا ہے اور ان کی اپنی دھیمی لے بھی سنی جاسکتی ہے۔ ان کی شاعری میں عمیق مشاہدہ اور نغمگی کے ساتھ روح عصر بھی ملتی ہے لیکن وہ طویل عرصے سے قریب قریب خاموش ہیں۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں ماحول اور سماجی مسائل کی عکاسی و شدت احساس نے ان کے اسلوب کو پسندیدہ تو بنادیا ہے لیکن گہرے اور سنجیدہ فکر کی کمی اسے زیادہ بلند ہونے نہیں دیتی۔
کیفی کی شاعری میں جو بھی اچھی خصوصیات ہیں وہ تبلیغ و تلقین اور نعرہ بازی کے حاوی رجحان سے مجروح ہوتی رہی ہیں۔ ان کے یہاں گھن گرج، عزم اور ولولہ تو ملتا ہے لیکن ٹھہراؤ اور باریک بینی کی کمی ہے۔

☆

آزاد نظم کی نظمیں سنوارنے والے چند اہم شعرا میں مخدوم کا نام بھی شامل ہے۔ مخدوم کی پہلی آزاد نظم "اندھیرا" ہے۔ آزاد نظم کی شاعری میں پہلی کوشش ہونے کے باوجود انھیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس نظم کے نغمے کا آہنگ شاداب ہے اور اس کا ہر ہر حرف غنائیت سے بھرپور ہے۔ "استالین" ان کی دوسری آزاد نظم ہے۔ مخدوم نے اپنی اس مشہور نظم کے ذریعے آزاد نظم کو ایک نئی کروٹ دینے کی کوشش کی۔ اس وقت تک آزاد نظم پر ن م راشد اور میراجی کا رنگ اس درجہ چھا گیا تھا کہ وہ لاشعور کی الجھنوں اور کلبیت کے نتیجے میں محدود ہوتی جا رہی تھی۔ آزاد نظم کے شعرا داخلیت اور لاشعور کے خول میں اسیر نظر آرہے تھے۔ "استالین" نے خارجی دنیا کو شعوری احساس کی روشنی دکھائی لیکن مخدوم جنھوں نے اس تبدیلی میں ایک اہم حصہ لیا اس نظم کے بعد برسوں تک خاموش رہے اور آزاد نظمیں نہیں لکھیں ورنہ وہ آزاد نظم میں ایک نئے اسلوب اور ایک نئے رجحان کے بانی تصور کیے جاتے۔ یہ کام علی سردار جعفری نے بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ جعفری نے شاندار کامیابیاں بھی حاصل کیں اور ٹھوکریں بھی کھائیں لیکن یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ انھوں نے آزاد نظم کو داخلیت سے نکال کر عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ "استالین" لکھنے کے بعد مخدوم جدوجہد اور انقلاب کے راستے پر

لگ گئے۔ تقریباً سات سال کی خاموشی کے بعد انھوں نے پہلی نظم لکھی وہ آزاد نظم "قید" ہے جو اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام کی پہلی نظم ہے۔ اس کے بعد ان کی تقریباً تمام اہم نظمیں آزاد نظمیں ہیں اور ان میں سے چند بلاشبہ اردو کی بہترین آزاد نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ مخدوم کی کئی آزاد نظموں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظمیں اور ان کے اشعار بھی روایتی اور پابند نظموں اور ان کے اشعار کی طرح گنگنائے اور گائے جانے کی حد تک مقبول اور زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشعار یا نظموں کی مقبولیت اُن کے معیار اور حُسن کو جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتی اور مخدوم کے اشعار کی مقبولیت میں اور بھی باتیں کارفرما ہو سکتی ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مخدوم نے آزاد نظم میں فکر و نغمہ کو ہم آہنگ کر دیا ان کے اسلوب میں سادگی اور روانی اور اظہار میں خوب صورتی ہے یہی وجہ ہے کہ شعریت اور تاثر چاہنے والوں کی تشفی ہو جاتی ہے۔

مخدوم کی شخصیت کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ ہمارے شاعروں میں سیاسی زندگی سے سب سے زیادہ گتھے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے محراب دل میں شاعری کی شمع جلائے

ہوے ہیں۔ مخدوم اپنی شاعری کی مختلف خوبیوں، مزاج کے ٹھہراؤ اور اعتدال اور فکر و فن میں جذباتیت اور عقلیت کے امتزاج اور سب سے بڑھ کر اپنے اشعار کی غنائیت کے باوجود شاعری میں کسی نئے اسلوب کے بانی نہیں ہیں۔ ان کی لے بحیثیت مجموعی انفرادیت ضرور رکھتی ہے۔ لیکن ایجاد کردہ نہیں ہے اور نہ ہی اس لے اور اسلوب کو دوسرے شاعروں نے اس طرح اپنایا ہے کہ ادب کا طالب علم اس کی نشان دہی کر سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخدوم نے اپنے دور کے شعرا کو متاثر نہیں کیا۔ مخدوم نے ہم عصر نوجوان شعرا کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے۔ مارکسی نظریہ رکھنے والے نوجوان شعرا مخدوم کی شخصیت اور ان کے راست اور غیر مبہم فکری میلانات سے بڑے متاثر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مخدوم نے پہلی بار انقلابی شاعری کے مفہوم کو واضح کیا۔ اس سے قبل انقلابی شاعری اپنے جوش و خروش اور شدت تاثر کے باوجود عقلیت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی تھی۔ سماجی انقلاب کیا ہے اس کا تصور کیا ہے۔ سیاسی پس منظر میں انقلاب کا خواب کیسے دیکھا جا سکتا ہے اسے واضح کرنے والوں میں ۱۹۳۰ء کے بعد کے نوجوان ترقی پسند شاعروں کے گروپ میں مخدوم یقیناً آگے رہے۔ مخدوم نے کسی نئے اسلوب یا نئی لے کو ایجاد کرنے کی کوشش میں بوجھل اور نامانوس تراکیب، تشبیہات و استعاروں کے ذریعے شاعری

کی زبان شاعرانہ اظہار اور شاعرانہ حسن کو متاثر بھی ہونے نہیں دیا۔ اس قسم کے تجربوں سے گریز ان کی محتاط روی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی عمل پر قانع ہو جاتے ہیں۔ صناعی کے عمل ریزہ کاری کے ذریعے وہ اس کی چکاچوند میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے اور سمجھتے ہیں کہ اس کے اپنے فطری حسن میں ہی بے پناہ کشش ہونی چاہیے اس لیے وہ ہیئت اور اسلوب کی پیچ پیچ راہوں سے گزرتے ہوئے احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتے ہیں۔

مخدوم نے اشاروں اور کنایوں سے کام ضرور لیا لیکن اپنی سیاسی اور انقلابی شاعری میں اسے ایک مستقل میلان اور طرز بنا نہ سکے۔ ان کا شعری سرمایہ مختصر اور محدود ہے۔ اساتذہ کے کلام میں بھی بیسیوں نظموں بھرتی کے صدہا اشعار فکر و خیال کی ناگوار تکرار اور دوسری ناہموار اور بے ہنگم باتیں مل جاتی ہیں لیکن مخدوم کے یہاں بھرتی کے اشعار اور نظمیں بہت کم ملیں گی وہ آورد کے قائل ہی نہیں آمد کے قائل ہیں یہ اور بات ہے کبھی کبھی انھوں نے دھوکے سے آورد کو آمد سمجھ لیا ہو۔

انھوں نے اپنے نظام فکر مارکسی نظریہ اور اپنے عقائد کے پرچار تلقین اور پروپگنڈہ کے لیے بھی اپنے اشعار کو ذریعہ نہیں بنایا۔ وقتی جذبے کے تحت ہنگامی واقعات اور موضوعات پر لکھی گئی نظمیں وقتی طور پر تو بہت پسند کی جاتی ہیں لیکن بعد میں

یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آیا اس قسم کی شاعری کو شاعری کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ایسے وقت جب کہ غزل کی نرم زمین میں بھی سیاسی مضامین کے بوجھل تذکرے، کرخت الفاظ اور تراکیب شامل ہورہی تھیں مخدوم یا تو خاموش رہے یا پھر انھوں نے اپنی نظموں کی لطافت، شیرینی اور نرمی کو اس کثافت سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ نعروں کے شور، کرخت آوازوں، ثقیل تراکیب، بندشوں اور نامانوس الفاظ سے وہ دور ہی رہے۔ بعد میں مخدوم نے تشکیک، اور نامل و تذبذب کے لہجے کو بھی اختیار کیا۔ فیض پہلے ہی اس لہجے کو اختیار کر چکے تھے ان کا لہجہ ایک مستقل اسلوب اور ایک نئی لے اور آواز کا خالق بن چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے چند سال کی مدت میں ہندستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں ایسے واقعات ہورہے تھے کہ عقیدے متزلزل ہورہے تھے۔ اعلیٰ اقدار پر سے اعتقاد اٹھتا جارہا تھا۔ ایک عجیب ذہنی ہیجان اور انتشار نے مشرق اور مغرب کے ذہن کو چونکا دیا۔ مخدوم نے تشکیک کا لہجہ ضرور اختیار کیا لیکن "گل تر" اور اس کے بعد ان کی ساری شاعری کا نچوڑ یہی ہے کہ ان کے راسخ عقیدے میں تبدیلی نہیں ہوی انسانیت اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر اب بھی انھیں بھرپور اعتماد ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حقیقت کا ادراک انھوں نے ایک حساس شاعر کے ذہنی ارتقاء کی اعلیٰ منزل پر پہنچ کر کیا ہے۔ فرار اور مایوسی کا

اظہار وہ ایک حقیقت اور ایک سچے ردعمل کی طرح کرتے ہیں لیکن ان کا ایقان ہے کہ اعلیٰ آدرشوں اور اونچے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے جہدِ مسلسل اور موم کی طرح جلنا پگھلنا ہی اہلِ جنوں کا مقدر ہے۔ سخت سے سخت نقاد بھی اس بات کا اعتراف کرے گا کہ مخدوم کے پاس ایسی تخلیقات بھی ہیں جو اردو شاعری میں اضافہ اور ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز ہیں وہ بعض ایسی دلکش نظموں اور غزلوں کے خالق ہیں جو کسی بھی انتخاب کی زینت بن سکتے ہیں۔

مخدوم کی شاعری کے لیے یہ فال نیک ہے کہ وہ جمالیاتی اقدار کو اپنے کلام میں مستحکم تر کرتے جا رہے ہیں۔ اب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مخدوم اسی انداز میں لکھتے اور گاتے رہے اور فن پر ریاض کے لیے فرصت نکالتے رہے تو ان کے اندر کا شاعر جو ابھی تک زندہ ہے ممکن ہے کہ چند اور لافانی نظموں کو جنم دے جس سے ان کا شاعرانہ مقام و مرتبہ اور بلند ہو سکے۔